فضیلہ ملہاق

دریافت کے میدان سے باہر

مختصر افسانوی مجموعہ

مترجم

ڈاکٹر لبنیٰ فرح

فضیلہ ملحاق

الجزائر

دریافت کے میدان سے باہر

مختصر افسانوی مجموعہ

مترجم

ڈاکٹر لبنیٰ فرح

فضیلہ ملحاق

دریافت کے میدان سے باہر

مختصر افسانوی مجموعہ

مترجم

ڈاکٹر لبنیٰ فرح

(مختصر کہانیوں مجموعہ)

علم ریاضی نے مجھے یہ سکھایا کہ ہر نامعلوم کی ایک قیمت ہوتی ہے لہذا کسی بھی ایسے شخص کو حقیر نہ جانو جسے تم جانتے نہیں

(ابراہیم اصلان)

ممکن ہے کہ میرے پاس حیران کن فتوحات نہ ہوں لیکن میں تمہیں ایسی ہزیمتوں سے حیران کر سکتا ہوں جن سے میں زندہ نکل آیا

(انتون چیخوف)

جہالت ہمیشہ غلامی کا دوسرا چہرہ ہوتی ہے (عبدالرحمن منیف)

بیشتر تاریخی حادثات میں نامعلوم شخصیت کوئی عورت تھی (ورجینیا وولف)

فہرست

سیریل نمبر	مضامین	صفحہ نمبر
1	ظاہری سچائی	1
2	محبت کا خمیر	9
3	خطرناک تخریب کار	15
4	تاریکی میں مشاہدہ	21
5	فاد کی جڑ	29
6	ناگ کاڈنگ	39
7	طوفان کی پھونک	47
8	ہوائی و برآبی باتیں	57
9	مختلف منظر نامہ	65
10	الٹا توقف	73
11	افسردگی آشکار کرنے والا آلہ	83
12	تجربہ ایک خرگوش ہے!	89
13	مٹی کی دھن	93
14	پرندے کا دماغ برائے نیلامی	107

ظاہری سچائی

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ
سچائی کائنات کے طول و عرض میں مکمل بے حجاب بھٹکتی تھی کہ
لوگ اس کی چکاچوند روشنی سے اسے پہچان لیتے تھے اور اس کی تکریم و استقبال
میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کے لیے سرگرداں رہتے تھے۔
دوسری طرف جھوٹ کائنات میں ہر جگہ چھپتا پھرتا تھا، حتیٰ کہ وہ
شاندار لباس اور شوخ رنگوں کو اوڑھنے میں مبالغہ آرائی بھی کرتا تھا۔
اس کے باوجود، اس کو قبول نہیں کیا جاتا تھا بلکہ اپنی بدصورتی کی وجہ سے وہ
شک و شبہ کا سبب بنتا تھا جبکہ ملبوسات بھی اس کو بالکل فائدہ نہ دیتے
تھے۔ اس کا سچائی سے حسد بڑھتا گیا۔
جھوٹ کو لگنے لگا کہ لوگ سچائی کی وجہ سے اسے چھوڑتے جا رہے ہیں لہٰذا اس
نے سچائی سے نبٹنے کا ارادہ کر لیا۔
اس نے سوچا کہ سچائی کو قتل کر دے یا جلا دے یا اس کی ہڈیاں توڑ دے تاکہ وہ
حرکت کرنے سے قاصر رہے۔ اگلے لمحے اس نے یہ سوچتے ہوئے اپنے ارادے
پر نظر ثانی کی کہ: "چاہے آلہء قتل نشہ بھی دیتا ہو لیکن بنی نوع انسان آہ و بکا سے دل
گرفتہ ہو جاتے ہیں۔
اس پر حملہ لوگوں کو میرے خلاف بھڑکائے گا جس سے سچائی ان کے دلوں
میں گھر کر لے گی۔
"اس کے علاوہ سرعام للکارنا اناڑیوں کا کام ہے جو عزت کی خاطر خود کو
قربان کر دیتے ہیں۔ جبکہ مجھے عزت سے کوئی سروکار نہیں کیونکہ یہ تو میری
پیدائش کے دن سے ہی غائب ہے"۔

جھوٹ نے ایک نیک بزرگ کا روپ دھارا اور سچائی کے راستے میں یہ کہتا ہوا آن کھڑا ہوا:

"عزیز من: کہاں جا رہی ہو؟"

سچائی اپنی معروف بے ساختگی سے بولی:

"وہاں، جہاں جھوٹ نہ ہو"

جھوٹ نے اپنا غصہ چھپایا اور خوشامدانہ انداز میں گویا ہوا:

"اس سے مشکل کوئی کام نہیں، کہ تم جہاں ہو وہاں جھوٹ نہ ہو کیونکہ تمھارا وجود ہی اس کو وہاں آنے کی دعوت دیتا ہے۔ اپنے حال پر رحم کرو۔ تم خواہ مخواہ انسان کی جہالت کی قیمت چکا رہی ہو۔"

سچائی حیرانی سے بولی:

"میں خود کو رحم یا قربانی کی نظر سے نہیں دیکھتی۔ میں نیکی، حق، بھلائی اور خوبصورتی کی خدمت پر مامور ہوں جبکہ نیکی کبھی خوبصورتی سے انکاری نہیں ہوتی، وہ برائی کے حیلے بہانوں اور ظلم کے باوجود اپنی جدوجہد میں ثابت قدم رہتی ہے۔"

جھوٹ بھانپ گیا، کہ جب تک سچائی نیکی کا دامن تھامے ہوئے ہے وہ اسے گمراہ نہیں کر سکتا۔ وہ نیکی کی "قوت" اور اس "تعلق کی پختگی" سے واقف تھا۔

اس نے اپنا سر جھکا اور بولا:

"تمھاری نیکی اخلاص کی مستحق ہے نہ کہ اذیت اور تکلیف کی۔"

سچائی حیرانی سے بولی:

"میں اس پر اپنی جان نچھاور کرتی ہوں۔"

"اس کائنات میں ہماری اکثر غلطیاں نادانستہ ہوتی ہیں۔ تم اپنی بے حجابی کی وجہ سے تکلیف کا سبب بنتی ہو، جو کہ الم ناک بات ہے۔ اکثر تم تکلیف دہ اور نفرت انگیز حقیقتوں کے ساتھ لوگوں پر عیاں ہو جاتی ہو، جس وجہ سے وہ نیکی

سے متنفر ہو جاتے ہیں۔ ان کو لگنے لگتا ہے کہ یہ سب ان کے لیے تکلیف کا سبب بن رہا ہے۔ انسان کی طبیعت کو سمجھو۔ خود کو کسی مناسب لباس سے ڈھانپ لو، چاہے اس کا رنگ اور ساخت کچھ بھی ہو۔ میرا نہیں خیال کہ یہ سب کچھ تمہارے مقاصد سے متصادم ہو گا۔"

جھوٹ نے ایک بزرگ دانا کا کردار اتنی خوبی سے نبھایا کہ سچائی نے اس کی نصیحت پر عمل شروع کر دیا۔ اس نے آسمان سے ایک بادل مانگا اور خود کو اس میں لپیٹ لیا لیکن یہ بھی اس کے نور کو چھپا نہ سکا اور لوگوں کے نزدیک اس کی قدر و منزلت کم کرنے میں ناکام رہا۔

جھوٹ کا حد انتہا کو پہنچ گیا۔ اس نے سچائی سے چھٹکارا پانے کے لیے کئی روز تک سوچا پھر اسے ایک ایسا خیال آیا کہ وہ خوشی سے جھومنے لگا اور بولا:

"انسان کی جملہ حماقتوں میں سے ایک یہ ہے کہ وہ ظاہری چیزوں پر یقین کر لیتا ہے۔ سچائی کے لیے کوئی بھی چیز احمقوں کی نظروں سے زیادہ مہلک نہیں ہو سکتی۔"

اس نے خود کو ایک بلوریں ہالہ سے آراستہ کیا اور سچائی کے راستے میں آ بیٹھا جو ابھی ابھی ایک گھمان کے معرکے سے لوٹی تھی، اور حسب معمول نور سے دمک رہی تھی۔ جھوٹ جانتا تھا، کہ وہ تھکی ہوئی لوٹے گی اور مکمل توجہ نہ دے پائے گی۔ اس لیے جیسے ہی اس نے سچائی کو دیکھا تو اس کا راستہ روکتے ہوئے بولا:

"میں حیران ہوں کہ سچائی خود کو دیکھنے سے قاصر ہے۔"

سچائی اس دبیز دھندلاہٹ کو جانتی تھی جو جھوٹ کو گھیرے ہوئے تھی۔ وہ اعتماد سے بولی:

"اندھا پن تاریکی کی صفات میں سے ہے، نہ کہ روشنی کی۔ تم نے اپنا حال احسن طریقے سے بیان کیا ہے۔ یہ بلوریں ہالہ کتنا قابل رحم ہے۔ تم نے اس کی پاکیزگی کو دھندلا دیا ہے۔"

جھوٹ طنزاً مسکرایا اور بولا:

"تمھارا غرور قابل رحم ہے۔ خود کو دیکھو کہ تم کیسے واپس آئی ہو! کمزور اور مایوس! تمھاری لڑائی شدید تھی کیونکہ میرے حمایتی بڑھ رہے ہیں، اور تمھارے پیروکار پسپا ہو رہے ہیں۔ ذرا نرگسیت کے اس ہالہ سے باہر آؤ اور حقیقت کا بہادری سے سامنا کرو۔"

سچائی سنجیدہ انداز سے بولی:

"ان تمام ہزیمتوں کے بعد جن سے میں تمھیں دوچار کر چکی ہوں، تم مجھ سے میری بہادری کا سوال کرتے ہو!"

جھوٹ نے لاپرواہی کی اداکاری کی اور بولا:

"ہاہاہا۔ اگر تم انسان کو میری طرح جانتی ہوتی تو انھیں فتوحات گردانتی نہ کہ ہزیمت۔ بنی نوع انسان ایک عجیب غیر متوقع مخلوق ہے جو اپنی خواہشات کے تابع ہے۔ وہ بآسانی خام خیالی، ظاہری چمک دمک اور فتنہ فساد کی طرف راغب ہو جاتا ہے۔ اور یہ سب کچھ ہی میرے پاس ہے۔ میں اتنے اچھے طریقے سے ایسے رنگوں اور شکلوں میں ان کے سامنے آتا ہوں، جو ان کی حرص کو پورا کرتے ہیں۔ جبکہ تم صرف اپنے نفس کی تسکین چاہتی ہوں۔"

سچائی غصے سے بولی:

"میرا وقت قیمتی ہے۔ اس کا ہر لمحہ بذات خود ایک کائنات ہے۔ مجھے تمھارے بہادری کے قصے سننے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں ان کو اچھی طرح جانتی ہوں اور ان سے بخوبی واقف ہوں یہ محض وقت کا ضیاع اور فضول محض ہیں۔"

جھوٹ فوراً زور دیتے ہوئے بولا:

"میں تمھارے ساتھ اتفاق کرتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ میں کائنات کو غلاظت سے داغدار کر رہا ہوں مگر انصاف کا تقاضا ہے کہ تم مجھے سنو اور مجھے صفائی پیش کرنے کا موقع دو۔"

"میں سمجھی نہیں"۔

"م اگر اپنی تاریخ کا جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہم دونوں انسان کی خود غرضی اور متلون مزاجی کا شکار ہو چکے ہیں۔ ہم ان کی ایسی زندگی کے لیے باہم معرکہ آراء ہیں جس کا ہمارا قریب و بعید کوئی واسطہ نہیں۔ اس لیے میں تمھیں پیشکش کرتا ہوں کہ ہم دونوں صلح کر لیں۔"

سچائی نے قدرے شک سے پوچھا:

"تم دراصل چاہتے کیا ہو؟"

"کہ ہم دونوں صفائی ستھرائی کرنے پر معاہدہ کر لیں۔"

سچائی جذباتی ہو کر بولی:

"میں فطرتاً صاف ستھری ہوں، مجھے اس کے لیے کسی معاہدے کی ضرورت نہیں ہے۔"

جھوٹ مکاری سے مسکرایا اور بولا:

"اے پاکیزہ اس میں تو کوئی شک نہیں، لیکن تمھیں علم نہیں کہ غلاظت تم سے چپک چکی ہے۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ ہم دونوں اکھٹے حمام چلتے ہیں تا کہ جو غلاظت تمھارے ساتھ غلطی سے چپک چکی ہے تم اس سے چھٹکارا پا سکو اور میں بھی اپنا قدیم بوجھ ہلکا کر سکوں۔ تمھاری کیا رائے ہے؟"

سچائی نے خود سے کہا:

"یہ اچھا موقع ہے کہ میں لوگوں کو جھوٹ کے شر سے ہمیشہ کے لیے نجات دلا دوں۔"

پھر سچائی نے اس سے پوچھا:

"میں جھوٹ پر یقین کیسے کروں؟"

جھوٹ نے اپنے چہرے کے تاثرات کو خوشگوار بنایا اور متاثر کن انداز میں بولا:

"میں تمھارے پاس بے حجاب آیا ہوں، جیسا کہ میں ہوں۔ میری طرف دیکھو! میں ناتوانی کے غبار، سانسوں کے بخارات اور گندگی کے ڈھیر کا ایک امتزاج ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ میں ہوا کے ایک جھونکے یا پانی کے ایک قطرے سے ہی ختم ہو جاؤں۔ میں نے اپنا جعلی لباس اتار دیا ہے اور خود کو ایک بلوریں شے سے ڈھانپ لیا ہے۔ اس سے زیادہ شفافیت اور وضاحت نہیں ہو سکتی۔"

سچائی جھوٹ کیے حجابی سے کافی حد تک متاثر ہوئی اور اسے صداقت کی دلیل گردانتے ہوئے اس کے ساتھ حمام کی طرف چل پڑی۔

دونوں ایک ہی جگہ بیٹھ گئے۔ سچائی نے اپنے اوپر پانی انڈیلا تو بادل اپنی مائع شکل میں لوٹ آیا اور نالے کے راستے بہہ گیا۔

جھوٹ نے اپنے آپ کو دھونے کے لیے گرم پانی کا نل کھولا مگر دھلا نہیں۔ اس نے گرم پانی کے بخارات کو بلوریں سطح پر جمع ہونے دیا۔ اور جب وہ باہر نکلا اور خود کو کھلی ہوا میں اپنے آپ کو دھونے کے لیے ٹھنڈا ہونے دیا، تو اس کے گرد بادل سے مشابہ ایک ہالہ سا بن گیا۔

سچائی حمام سے بالکل بے لباس برآمد ہوئی کہ لوگ اس کو پہچان نہ سکے کیونکہ وہ اسے بادل میں لپٹا دیکھنے کے عادی تھے۔ انھوں نے سوچا کہ یہ جھوٹ کی مکاریوں میں سے کوئی مکاری ہے لہٰذا انھوں نے اسے نکال باہر پھینکا۔

دوسری طرف جب جھوٹ برآمد ہوا تو بلوریں بخارات میں ملبوس، تفاخر سے چل رہا تھا۔ اس لیے لوگوں نے سمجھا کہ وہ ہی سچائی ہے تو انھوں نے اس کا بھرپور استقبال کیا۔

سچائی جھوٹ کی چال سمجھ چکی تھی لہٰذا وہ ہر جگہ شکوہ کناں، لوگوں کو خبردار کرنے لگی کہ جھوٹ بلوریں لباس میں ملبوس ہے۔

جبکہ جھوٹ نے بھی کوئی ایسا وسیلہ نہ چھوڑا جس سے وہ سچائی کو جھوٹا ظاہر کر سکے۔

خود کو حق پر ثابت کرنے کے لیے ان میں جھگڑا شدت اختیار کر تا گیا تو لوگ اس معاملہ کو ایک عقلمند شخص کے پاس لے گئے اور اس سے درخواست کی کہ ان دونوں کے مابین فیصلہ کر دے۔

دانا شخص نے مطالبہ کیا کہ دونوں کو اس کے سامنے پیش کیا جائے اور وہ سب کے سامنے اپنے دلائل دیں۔ دانا شخص نے دونوں کو لوگوں کے ایک جمِ غفیر کے درمیان کھڑا ہونے کا اشارہ کیا اور کہا:

"لباس اتارو تاکہ ہم تم دونوں میں سے سچے کو پہچان سکیں۔"

سچائی کو شرم آ گئی اور وہ اصرار کے بعد ہی بے لباس ہوئی۔ اپنی اصل حالت میں نظر آئے اسے ایک زمانہ گزر چکا تھا اس لیے وہ متذبذب دکھائی دے رہی تھی لہٰذا لوگوں کو اس پر شک ہونے لگا۔

جبکہ جھوٹ جلدی سے بے لباس ہو گیا، اس لیے وہ سچا نظر آنے لگا۔

اس کی فراست سچ ثابت ہو گئی! لوگوں نے اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔

کسی نے بھی اس نور پر توجہ نہیں دی جو سچائی میں سے پھوٹ رہا تھا اور نہ اس دھندلاہٹ کی طرف جس سے جھوٹ تشکیل پایا تھا۔

حاضرین کی اکثریت سچائی کو دھندلاہٹ کے لباس میں دیکھنے کی عادی ہو چکی تھی جبکہ انھوں نے جھوٹ کو بے لباس نہیں دیکھا تھا۔

مگر اس عقلمند شخص کو اپنے تجربے کی بنا پر ادراک ہو گیا کہ سچائی وہ ہے جس نے بے لباس ہونے میں ہچکچاہٹ محسوس کی ہے، اسے اس بات سے حیا آ گئی تھی کہ خود کو سچا ثابت کرنے کے لیے کوئی حیلہ اختیار کرے۔

جبکہ جھوٹ وہ ہے جس نے بے لباس ہونے میں جلدی کی ہے کیونکہ ایسی جرات وہی دکھاتا ہے جسے صرف مقصد کے حصول سے غرض ہوتی ہے۔
لیکن اس دانا شخص کے لئے ضروری تھا کہ وہ ایک ایسی مناسب وکافی دلیل تلاش کرے جس سے دوسرے بھی قائل ہو جائیں۔
لہٰذا جھگڑا شک کا فائدہ دیتے ہوئے ختم ہو گیا۔ ان دونوں میں سے کسی کو بھی جھوٹا قرار نہیں دیا جا سکتا تھا اور سچائی کے عیاں ہونے اور جھوٹ کے ملبوس ہونے پر یقین کرنے والوں کا یہ تنازعہ تا حال جاری ہے۔
اور یہ یقین اب بھی عقل ودانش کے پاس ہی ہے کیونکہ جو اس سے بہرہ ور ہے صرف وہی ملبوس سچائی اور عیاں سچائی کے فرق کو پہچانتا ہے۔

محبت کا خمیر

"مبارک! تمھیں معجنات شہر میں رہائش کا اجازت نامہ ملنے پر مبارک ہو۔"

باکیر نے تہنیتی پیغامات کی بہتات کر دی جبکہ زیاد خاموش رہا اور اس کی نظریں جامد ہی رہیں۔ اس کی بے توجہی سے باکیر برانگیختہ ہو گیا، وہ پھٹ پڑا اور اسے ملامت کرتے ہوئے بولا:

"مبارک باد پر شکریہ تو ادا کرو۔"

زیاد نے کھوئی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا، اور پھر مغموم آواز میں بولا:

"کیا دکھ مبارک باد کا مستحق ہوتا ہے؟ میں نے مکسرات شہر صرف اس لیے چھوڑا، جب میری سانسیں بگڑنے لگی تھیں، میری امیدیں چکنا چور ہو چکی تھیں اور فضا میری مکرّر باتوں سے تھک گئی تھی۔ لگتا ہے کہ میرا مقدر ہے کہ یا تو میں ٹوٹ جاؤں یا اپاہج ہو جاؤں جبکہ میں ناممکن کی خواہش نہیں کر رہا۔ میں اپنے لیے سوائے بھلائی کے کسی چیز کا طلبگار نہیں۔ کیا یہ زیادہ ہے؟"

باکیر نے اس کا کندھا تھپتھپایا اور کہا:

"اب تمھارے لیے ممکن ہے کہ تم آزادانہ قدم اٹھاؤ"۔

زیاد نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری، اور زمین سے اپنی نظریں اٹھائے بنا اداس لہجے میں بولا:

"لیکن مجھے محتاط رہنا ہوگا۔ معجنات میں قدم اٹھانے کے اتنے پہلو ہیں کہ دماغ کے مختلف حصوں میں کسی گندھے ہوئے آٹے کی مانند سر پیٹ رہے ہیں جبکہ خواب کبھی بھی پیسنے، گوندھنے، پکانے، نگلنے اور ہضم کرنے سے مبرا نہیں ہوتا۔ ہمارے کچھ منصوبے ریزہ ریزہ ہو چکے ہیں۔ ایک خواہش ہمیں توڑتی ہے تو دوسری ہمیں کچل دیتی ہے

اور یہاں ہم آٹے کا ایک ایسا مرکب بن جاتے ہیں کہ ایک گندھا ہوا آٹا ہمیں تحریر کرتا ہے تو دوسرا منسوخ کر دیتا ہے۔"

"مجھے تمھارے خدشات کی سمجھ نہیں آئی"

"خدشات نے مجھے اس قدر پابند کر رکھا ہے کہ میں انھیں کھانے کے علاوہ اور کوئی طلب نہیں رکھتا اور میری ٹوٹی ہڈیاں مرہم پٹی کے سوا کچھ نہیں چاہتیں۔"

"تمھارے لیے راحت کے جملہ سامان مہیا کر رہے ہیں۔ کیا اس سے بہتر کوئی زندگی ہے؟"

"کیا ایسے شہر میں کوئی زندگی ہے، جہاں انسان پر اس کے پیٹ اور زخموں کے ذریعے حکمرانی کی جاتی ہو؟ پھر وہاں اور یہاں میں فرق کیا ہے؟"

باکیر نے غصّے سے اس کی طرف دیکھا۔ اس نے خود پر افسوس کیا کہ وہ اس کے پاس آیا جو محض پیسنے اور گوندھنے والی مشینوں کی مرمت کرنے والا مکینک ہے۔ پناہ گزینوں کے مرکز میں ایک طویل وقت گزر گیا جبکہ گڑیا بنانے والے کو رہائش کا اجازت نامہ ایک مہینے میں مل گیا تھا۔

وہ مایوس ہو کر اس زیاد کو مبارک باد دینے والوں کے ہجوم میں ہکا بکا چھوڑ کر چلا گیا جو نہیں جانتا تھا کہ اس ہجوم کے تجسس کے ساتھ کیسے نبٹے۔ زیاد مجبور ہو گیا کہ ایک ریستوران میں دی گئی دعوت کو قبول کرے اور ان کیوہ اشارے کنایے برداشت کرے جن کا جواز مشکوک تھا۔

اس نے صرف اپنے وجود کو کرسی پر رکھا ہوا تھا۔ ان کے وہ سوالات اس پر برس رہے تھے جو کیمپ کے رہائشی اجازت نامہ کے حصول کے طریقہ کار پر شک کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے تو اس کی نئی حیثیت کے حوالے سے تحقیر آمیز لہجے کی وجہ سے حیران ہی کر دیا:

"تو یہ کھیتی باڑی ہے، اے خشک میوہ جات کے بیٹے! یا میں تمھیں کیا نام دوں؟ مونگ پھلی، اخروٹ، بادام، ریٹھا... پستہ! ہاہاہا۔

ایک دوسرے نے سوال کیا:

"سخت یا نرم؟"

زیاد جانتا تھا کہ سختی سے اس کی مراد فکری جبر اور خطرے کا سامنا ہے جبکہ نرمی کا مطلب جنسی تشدد کا شکار ہونا ہے اور یہ معجنات شہر میں پناہ کی درخواست کی مختلف اقسام ہیں۔

طنزیہ مسکراہٹ، بے رحمانہ تاثرات جو اس نے غیر مرئی طور پر دوسرے حاضرین تک باہم پہنچائے وہ ان کو برداشت نہ کر سکا۔

اس نے پھنکار کر اس کو جواب دیا:

"کمینے"

ایک دوسرا اس کے جواب پر پکا:

"تب تو یہ ایک بڑا شکار ہے!"

انھوں نے ایسی نظروں کا تبادلہ کیا، گویا اس پر اپنے شہر سے پیسوں کی اسمگلنگ کا الزام لگا رہی تھیں۔ پھر ان میں سے ایک کی زبان پر ان کے شکوک و شبہات یہ کہتے ہوئے آ ہی گئے!

"تمھارے پاس دولت ہے!"

"میری پاس سوچ ہے۔"

ان میں سے اکثر طنز سے بھرپور لہجے میں بولے:

"سوچ!"

زیاد نے کرب سے دل میں سوچا:

"ان تاریک ذہنوں کو صرف اس بات سے سروکار ہے کہ سورج کی مذمت کیسے کی جائے! انھیں یہ بتانے کا کوئی فائدہ نہیں کہ جو چیز مجھے یہاں لے کر آئی وہ ایک کھیل ہے۔ بچوں کا سادہ کھیل، جس کو اس طرح ترتیب دیا گیا کہ وہ بچے میں کائنات کا مشاہدہ کرنا پروان چڑھائے؟!"

ہال کی روشنیاں اچانک مدھم ہو گئیں اور اسے ان کی اشتعال انگیزیوں سے نجات مل گئی۔ وہ سب ٹی وی اسکرین کی طرف متوجہ ہو گئے اور اپنی نظریں اناؤنسر کے چہرے پر مرکوز کر لیں جو تصاویر کے ایک مجموعہ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فخر سے کہہ رہا تھا:

"معجنات شہر کے کارخانوں نے کیمیائی خمیر سے سپرے گن کا ایک جدید ترین ماڈل تیار کیا ہے۔ اس کی منفرد شکل کو دیکھیں! یہ بچے کے کھلونے سے ملتی جلتی ہے لیکن اس کی سانسیں کسی دیومالائی اژدھا والی ہیں!"

زیاد کی نگاہیں سکرین پر پیوست ہو گئیں۔ اس کی نظروں سے مایوسی جھلک رہی تھی اور وہ بڑبڑاتے ہوئے بولا:

"میرے ڈیزائن اسلحہ کے مجسموں میں ڈھل گئے ہیں!

میں ایک ایسا شخص ہوں کہ جس نے یہ خواہش کرتے ہوئے کہ زندگی کی محبت دلوں میں اجاگر ہو جائے، بہت تکلیف اٹھائی ہے!

انھوں نے محبت کے خمیر کو تباہی کا موجب بنا دیا ہے!"

اس کے ذہن میں کھیلوں کے وہ خاکے گھوم گئے جو اس نے پناہ کی درخواست کے دفتر کو پیش کیے تھے۔ اسے لگا کہ وجود کا بوجھ اس پر اکٹھا ہو رہا ہے اور اس کے سینے پر دباؤ بڑھ رہا ہے۔ اسے سانس گھٹتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

اس نے اپنی کرسی کو پیچھے کر لیا تاکہ وہ اس ایجاد بارے تحسین آمیز تبصروں سے اجتناب کر سکے لیکن اس کے ساتھیوں نے اسے اپنے درد کے ساتھ تنہا رہنے کا

موقع ہی نہیں دیا۔ جیسے ہی ٹی وی کی آواز کم ہوئی تو ان میں سے ایک نے گفتگو کو دوبارہ اپنی پٹڑی پر ڈال دیا۔ اس نے اسے قدرے طنزیہ لہجے میں کہا:

"تو، یہ سوچ ہے!"

زیادکرب بھرے انداز میں بولا:

"کہ بچوں کو کھیل کی معصومیت کا پتا چل سکے اور بڑوں کو جستجو کی غیر جانبداری کا ادراک ہو سکے۔"

اس کے مخاطب نے اپنا ہاتھ ساتھ والے کے ہاتھ پر مارا اور مذاق اڑاتے ہوئے کہا:

"اناڑی بچے! اسے بچوں کے کھیلوں کا خیال ہے جبکہ سب سے دلچسپ کھیل تو بڑوں کے کھیل ہوتے ہیں!"

دوسرا ہنسا اور حمایت کرتے ہوئے بولا:

"وہ محبت کے کھیل کی معصومیت کے لئے اداکاری کر رہا ہے!"

ایک اور نے اضافہ کیا:

"وہ چاہتا ہے کہ ہم بچے ہی رہیں!"

اس کے ارد گرد قہقہے پھوٹ پڑے اور رنگ برنگے تبصرے ہونے لگے تو اس کی بے نیازی کے تاثرات زیادہ واضح ہو گئے۔ اس نے ویٹر کو کھانے کا بل جلدی سے دینے کا کہا۔

اس پر مطلوبہ رقم رکھی اور اپنا کھانا کھانے سے قبل ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ ان کی نظریں اس کے چہرے پر مرکوز ہو گئیں۔ وہ اس کے رویے سے جیسے ششدر رہ گئے تھے۔ اس نے ان کو الوداعی تاثرات سے بھرپور نظروں سے دیکھا اور کہا:

"بچے زندگی کی خاطر کھیلتے ہیں جبکہ بڑے زندگی کے ساتھ کھیلتے ہیں! مشکل ہے کہ ہم ہمیشہ بچے ہی رہیں!"

خطرناک تخریب کار

خوابوں کی قطاروں نے یادوں کی راکھ میں انگڑائی لی تو اس کے اندر ایک دیرینہ خواہش کو جلا دینے والے دھارے ابل پڑے، ایک ایسی خواہش جسے وہ سمجھتا تھا کہ ہمیشہ کے لیے دم توڑ چکی تھی۔

وہ اب ایک ایسا نوجوان نہیں رہا تھا جو زندگی کی سختی کا مقابلہ کرنے کے لیے جستجو اور استقامت سے لبریز آنکھوں کے ساتھ ہمہ وقت تیار ہو۔

زندگی کے تجربات سے سبق سیکھ کر بڑا قدم اٹھانا ایک ماہ و سال کی قیمت ادا کرنے جیسا ہو سکتا ہے۔

اب وہ کئی چیزوں کو مدنظر رکھنے لگا تھا جیسے آئینہ۔ جب وہ اس کا سامنا اپنے خدوخال پر زمانے کے گردافروز آثار کیساتھ کرتا، تو اس کی یادیں ان خواہشات کی طرف لوٹ جاتیں، جن کے سائے سے چمٹے رہنے نے اسے تھکا دیا تھا۔

اس نے آئینہ میں منعکس ہونے والی اپنی صورت کو بغور دیکھا اور پھر الجھن کے ساتھ پوچھا:

"وہ کون ہے جس کے ساتھ میں لوٹوں گا؟ عیسیٰ کا کیا بچا ہے؟ وہ نوجوان جس نے اپنا وطن کچھ سال قبل ٹوٹے خوابوں کے ساتھ چھوڑا تھا، جبکہ کچھ ایسے بھی تھے جن کو پرکشش زندگی کی خوشبوئیں اپنی طرف کھینچ رہی تھیں۔"

گھنٹی کی آواز نے اس کی افکار کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ تشریف لانے والوں میں سے پہلا شخص اسے الوداع کہنے کے لیے پہنچ گیا تھا۔ اس نے اپنے دوست جبران کو گرمجوشی سے گلے لگایا اور ایک ایسے کرب سے بولا جس کو ایک گہری مسکراہٹ نے چھپا رکھا تھا:

"کس نے تصور کیا تھا کہ میں لوٹ آؤں گا۔"

جبران نے اس کی طرف اداس نظروں سے دیکھا اور کہا:

"تم مجبور نہیں ہو۔"

اس نے سختی سے اس کو ٹوکا:

"نہیں، نہیں ہرگز نہیں۔ ان کی نظریں تقریباً ہماری جلد کو ہمارے جسم سے الگ کر دیتی ہیں۔ میں اب خود کو محفوظ محسوس نہیں کرتا۔ جب سے وہ بم علاقے کے قہوہ خانہ میں پھٹا ہے تب سے نقاب اتر گئے ہیں اور اچانک وہ نظریں غائب ہو گئی ہیں جو گرمجوشی اور محبت کی ریاکاری کرتی تھیں۔ ان کی جگہ طویل الزامات اور شکوک نے لے لی ہے جو ہمیں پریشان اور بے یقینی سے بھر رہے ہیں۔"

جبران نے گہری سانس لی اور بولا:

"انسان کی کج فہمی نے ایک ایسا جہنمی آلہ ایجاد کر لیا ہے، جس سے وہ دوسروں کے ساتھ اپنے حساب پورے کرتا ہے۔ اس ایجاد کا نام دہشت گردی ہے۔ یہ ایک جادوئی دستاویز ہے۔ وہ جس کے لیے چاہیں اور جب چاہیں اس کا واویلا کر دیتے ہیں۔ اس کے مطابق انھوں نے ہمارے وجود کو دقیانوسی تصورات قرار دے رکھا ہے، جو ان کے مزاج کی خدمت پر مامور ہیں۔ چاہے یہ کام انسان کو کچلنے، گوندھنے، ٹکڑے ٹکڑے کرنے اور اس کو اختلافات، جنگوں کی بھٹی میں پکانا ہو"۔

عیسیٰ نے حسرت آمیز لہجے میں جواب دیا:

"ڈریکولا اس مرتبہ ہمارے لیے ووٹ کا صندوقچہ لادو۔ وہ جارح، انتہا پسند شخص ہمارے ملک کا صدر بن چکا ہے۔"

جبران نے غور سے اسے دیکھا اور کہا:

"جیسے وہ موجود ہے جو انسان کو گراتا بھی ہے اور اسے اٹھائے گا بھی۔ کوچ کی جلدی نہ کرو۔ حالات کے دباؤ میں اپنے فیصلے نہ کرو۔ مجھے پتا ہے کہ تم ان تمام مہاجرین

کی مانند جو سمندر کے دوسرے کنارے سے آتے ہیں، تم تکلیف میں ہو۔ لیکن یہ حالات کچھ سیاسی مقاصد کی پیداوار ہیں۔ کچھ وقت اس کے بعد کھوکھلی تقریریں ختم ہو جائیں گی اور ہماری زندگی معمول پر یعنی رواداری اور امن کی طرف لوٹ آئے گی۔"

عیسیٰ قدرے شک سے بولا:

"میں مزید زندہ نہیں رہ سکتا۔ لگتا ہے جیسے میرے اندر کوئی ایسی چیز ٹوٹ گئی ہے جس کی اصلاح مشکل ہے۔ مجھے نہیں لگتا کہ میں اپنے گھر میں ہوں۔ میں وہاں لوٹ جاؤں گا جہاں سے آیا تھا، اپنے گھر کی طرف۔"

گھنٹی مسلسل بجتی رہی۔ باقی دوستوں کے آنے سے مزید مصروفیات بڑھ گئیں۔ ان میں سے ایک کہنے لگا:

"وہاں کی صورتحال یہاں سے بہتر نہیں ہے۔"

ایک خوفناک خاموشی چھا گئی۔

چائیدان اور پیالیوں کے مابین جاری بات چیت ان کی بڑھتے ہوئے عدم تحفظ کے احساس سے مدہوش آہوں پر جیسے غالب آ گئی۔ عیسیٰ نے ان کی باتوں سے ذرا ہٹ کر فضا اور یادوں کو ذہن میں لاتے ہوئے اپنی نظروں کو کمرے میں گھمایا۔

"انسان جب کسی ایسی جگہ سے بچھڑ رہا ہو جس سے اسے لگاؤ ہو تو وہ اجنبیت محسوس کرتا ہے۔ اور تب بھی اجنبیت محسوس کرتا ہے جب وہ وہاں لوٹے جہاں آنے کے بعد اسے لگاؤ ہو چکا تھا۔ انسان اپنی زندگی میں ایک اجنبیت سے دوسری اجنبیت کی طرف سفر کرتا ہے۔"

جب وہ رات کے آخری پہر وہاں سے رخصت ہو رہے تھے تو اس نے خود سے کہا کہ وہ ایک بت کی مانند کھڑکی کے پیچھے کھڑا ہے۔ اس کی نظریں مدھم

ہوتے افق پر جمی ہوئی ہیں اور یادوں نے اس کی زندگی کی ٹیپ میں سے کچھ تصویریں چن لیں لیکن اس نے اپنا بیگ اٹھایا اور ہوائی اڈے کی جانب چل پڑا۔

جوں ہی وہ انتظار گاہ میں داخل ہوا تو سائرن بج گیا اور بھاری اسلحہ، آنسو گیس کے شیل، ڈھالوں سے لیس افراد نے اسے گھیر لیا۔

نظروں نے اس کے ارد گرد تیر برسائے، خوف زدہ جسم اس سے دور ہوتے گئے اور منہ کی غلیلوں نے اس پر گالیوں، الزامات کی بوچھاڑ کر دی۔

اس نے خوف سے زمین پر پڑے اپنے بیگ کو دیکھا جس میں پڑی چیزیں اس میں سے یوں نکلی ہوئی تھیں جیسے ایک ایسے شکار کی آنتیں نکلی ہوتی ہیں جس کو خطرناک دانتوں سے بھنبھوڑا گیا ہو۔ وہ التجا کرتے ہوئے چیخا:

"میں تم سے درخواست کرتا ہوں، اس کے ساتھ چھیڑ خانی نہ کرو! یہ میری عمر بھر کا حاصل ہے۔ میری تازہ ترین ایجاد کا نقشہ ہے۔"

اس کو گھیرنے والوں میں سے ایک لاپروائی سے بولا:

"تمھیں اس کی کیا ضرورت ہے؟"

وہ پریشانی کے عالم میں بولا:

"میں اس کے ذریعے ایجاد کا اندراج کرواؤں گا۔"

اس کے ارد گرد قہقہے پھوٹ پڑے اور اسی شخص کی طنزیہ آواز دوبارہ بلند ہوئی:

"ہاہاہا۔ اگر تمھارے شہر کے لوگ ایسے منصوبوں کی پروا کرتے تو تم ہمارے پاس کیوں آتے! اچھا ہوا کہ ہم نے تمھارے کوچ کا سامان کر دیا۔"

ان محاصرہ کرنے والوں کے قائد نے جلدی سے اس سے پوچھا:

"ہمیں تخریب کاروں سے اپنے رابطے کے بارے میں بتاؤ کہ یہ مہلک اسلحہ ان تک کیسے پہنچے گا۔"

عیسیٰ دہشت سے بولا:

"تخریب کار! میرا ان سے کیا واسطہ؟ دستاویزات کو دیکھو۔ یہ فصل کی کٹائی کرنے والی ایک مشین ہے جو شمسی توانائی سے چلتی ہے۔ یہ ایجاد ماحول کی حفاظت کرے گی۔"

محاصرہ کرنیوالوں کے قائد نیاس کی توضیحات کی کوئی پرواہ نہ کی۔ اس کی بھنویں تن گئیں اور اس نے اپنے آدمیوں کو سخت لہجہ میں کہا:

"اس کو پکڑو اور اس پر سخت پہرا رکھو! یہ ایک خطرناک تخریب کار ہے۔"

اس کے معاون نے اس کی طرف حیرانی سے دیکھا اور پھر اس کو متنبہ کہتے ہوئے سرگوشی کی:

"اس کا نام مطلوب افراد کی فہرست میں نہیں ہے۔"

اس نے غصے سے اپنے جبڑے چبائے اور اسے سرگوشی کی:

"اس کا نام ہمارے موجدوں کی فہرست میں نہیں ہے۔"

تاریکی میں مشاہدہ

رات بہت سیاہ تھی اور خاموشی نے گویا یہاں ڈیرا ڈالا ہوا تھا۔
صالح نے بالکونی کی دیوار پر ٹیک لگائی اور اپنی ہتھیلیاں سکون سے پھیلا دیں۔ اس نے سگریٹ کا ایک سرا سلگایا اور اس کو اتنے انہماک سے جھاڑا جیسے کوئی زندگی کے آخری لمحات سے لطف اندوز ہو رہا ہو۔
اس کے دماغ میں یادیں بھڑک اٹھیں۔ اس نے اپنے تخیل کی ڈھلوانوں پر منظر بہ منظر چڑھنا شروع کر دیا۔
گویا کہ وہ کوئی سینمائی ٹیپ تھی!
کبھی وہ پیہم سادہ نوجوان تھا، جس کی زندگی سیدھی سادی اور مواقع کم مایہ بلکہ تقریباً خاک برابر تھے جبکہ اس کی خواہشات پیچیدہ اور افزائش پذیر تھیں جن کی آسمان کے سوا کوئی حد نہ تھی۔
اور وہ ایک بے نیاز غریب نوجوان تھا۔ اس کی زندگی سرد اور مال و آسائش سے خالی تھی جبکہ اس کا سینہ خوبصورت تصورات سے دہکتا ہوا خوابوں کی خوشبوؤں سے لبالب تھا۔
اس نے منتشر سانسوں کے ساتھ اپنا مسکن چھوڑا تھا اور آج وہ مانوس اور لہلہاتی فصل کے میدان کی طرف پر سکون سانسوں کے ساتھ لوٹ رہا تھا، جہاں دل اور عقل کی کٹائی ہوتی تھی۔ وہ ایک مشہور مصور بن چکا تھا جو ایک شاندار محلے میں رہتا تھا اور اس سے بڑھ کر یہ کہ اس نے ماریہ سے شادی کی جو اس کی بچپن کی ساتھی اور پردیس کا تحفہ تھی۔
"کیا میں نے اپنے خواب مکمل کر لیے ہیں؟"

اس کے ہونٹوں نے لاحاصل حرکات کیں اور اس کی نظر ماریہ کی طرف پھیل گئی۔ اسے لگا کہ کمرہ اس پچاس سالہ چہرے سے دمک اٹھا ہے جس نے ابھی بھی جوانی کی تازگی برقرار رکھی ہوئی ہے۔

اس نے دیکھا کہ اس کی جان بستر پر دراز ہے اور اپنے تکیے سے یوں چپکی ہوئی ہے جیسے کوئی بچہ اپنی ماں کی گود سے لپٹا ہو۔

اس نے خود کو متنبہ کیا کہ وہ ایک منفرد تصویر کے سامنے ہے جس کو پیش کرنے میں اس کے دل نے کمال کر دیا ہے۔ اس کے چہرے پر ایک وسیع مسکراہٹ پھیل گئی۔

اس نے سلگتے سگریٹ کو بجھا دیا اور اس کا احساس اس اتفاق سے بھڑک اٹھا کہ جس نے ان دونوں کو پھولوں کی دکان کے سامنے، ایک دوسرے ملک میں اور مختلف حالات میں کھو دینے کے بعد ایک دوسرے کو دوبارہ دیکھنے کی امید سے اکٹھا کر دیا تھا۔

ایک عرصے سے مخفی عطر جیسے آزاد ہو گیا، کیونکہ ماضی میں ماریہ کے والد نے عقیدہ کے اختلاف اور صالح کی مادی حالت کی وجہ سے ان دونوں کے ایک بندھن میں بندھنے سے انکار کر دیا تھا۔

وطن کی دوریوں نے ان دونوں کو جدا کیا اور پردیس کی تنگناؤں نے ان دونوں کو ملا دیا تھا۔ پردیس کے اپنے ہی جھمیلے اور برکات ہوتی ہیں۔

اب بھی ماریہ کے لیے اس کے پاس اپنے دل کے سوا حق مہر نہیں تھا لیکن اس کے والدین نے ماضی کی طرح صالح کو رد نہیں کیا بلکہ ترجیح دی کہ ان کی بیٹی اپنے قدیم پڑوسی سے رابطہ کرے جو اس کے شہر کا باسی ہے اور اس کی قدر کرتا ہے، بجائے اس کے کہ وہ کسی اجنبی شخص سے تعلق استوار کرے جس کے بارے میں وہ کچھ بھی نہیں جانتی۔

کل کا اجنبی آج مقرب بن چکا تھا۔ جیسے ریاضی کی کسی مساوات میں طرفین جنوں ظاہر ہوا اور فاصلے سمٹ جاتے ہیں۔ مجوزہ نمائش میں صرف چند دن باقی تھے جس کو وہ اپنے بچپن کے گھر میں کرنا چاہتا تھا تاکہ اس کے پرانے خوابوں کی تکمیل ہو سکے۔

وہ دوبارہ ماریہ کا چہرہ دیکھنے لگا۔ اسے لگا کہ اس کی تمام خواہشات غالب آنے لگی ہیں۔ اس نے سگریٹ بجھایا اور اس کی جانب بڑھا۔ اس نے اپنی راہ کو اندھیرے میں احتیاط سے ٹٹولا تاکہ اس کا بستر بھی نہ ہلے۔

وہ ڈھیروں ملے جلے احساسات، جو گرم جوش احساس تحفظ اور سرد مہری کے خوف کا امتزاج تھے، لیے اس کے پہلو میں لیٹ گیا۔ پھر اس نے خود کو نیند کے سپرد کر دیا۔ اچانک دروازے پر زوردار کھڑ کھڑاہٹ کی آواز سے بیدار ہو کر اس نے شدید وسوسوں کیساتھ بستر سے چھلانگ لگائی اور وہ تقریباً آواز کے منبع کے قریب پہنچنے والا ہی تھا کہ دروازہ زور سے کھلا۔ نہ وقت اور نہ ہی اس کے خوف نے موقع دیا کہ وہ اس بات کا اندازہ لگا سکے کہ دروازہ چابی سے کھلا ہے یا تالہ توڑنے سے۔

وہ کیا دیکھتا ہے کہ ایک موم کے مجسمے کی طرح بھاری اسلحہ اور وحشت سے لیس آدمیوں کی نفری کے درمیان کھڑا تھا۔ چند لمحوں میں فلیٹ کباڑ خانہ بن گیا: الٹی ہوئی کرسیاں، اکھڑے ہوئے خالی دراز، کھلے تکیے، فائلیں اور کپڑے یہاں وہاں بکھرے پڑے تھے۔

دراندازوں میں سے ایک نے اس کی طرف ٹکٹکی سے دیکھا اور طنزیہ لہجے میں کہا:

"شاید سگریٹ کا سلگنا تمہیں بجلی کی روشنی سے بے نیاز کر دیتا ہے! باصلاحیت چمگادڑ اور کفایت شعار!

اس نے حیرانی سے نظر کو چہروں پر گھمایا پھر اس دراندازکے ہونٹوں پر نگاہیں مرکوز کر دیں جو حقارت اور جھٹکے سے کھل اور بند ہو رہے تھے۔ اس دراندازنے اپنے ہونٹوں کو ہوا میں توپ کے دہانے کی مانند کھولا اور غصے بھرے لہجے میں اس سے پوچھا:

"تاریکی کی منصوبہ بندی میں تمھارے شراکت دار کون ہیں؟"

صالح نے کانپتی سانسوں سے جواب دیا:

"منصوبہ بندی؟ تاریکی میں مشاہدہ' تو میری نئی نمائش کا عنوان ہے۔ میں نے اپنی تصویروں کے ذریعے آج کے انسان کی گہرائیوں میں مخفی کچھ احساسات کو مجسم کرنے کی کوشش کی ہے"

اس دراندازکی آنکھوں نے ان تصویروں میں سے جو اس کے ساتھیوں نے تہہ خانے سے نکالی تھیں ایک تصویر کو بغور دیکھنا شروع کیا اور صالح کو مزید شر انگیز اعتماد سے جواب دیا:

"مضحکہ خیز بات یہ ہے کہ تمھارا نام صالح ہے۔ تم تو انسانی سلامتی کے لیے خطرہ ہو۔"

صالح نے شدید الجھن سے کہا:

"کون سا خطرہ! میں نے یہ تصویر ماریہ کے لئے بنائی ہے۔ میں نے اس پہلے گھر کی تصویر بنائی ہے جس نے ہم دونوں کو ملایا تھا۔ وہ اپنی سادگی کی وجہ سے ایک مضبوط عمارت تھی جو تمام حالات وواقعات سے بالاتر تھی۔"

اس دراندازنے طنزیہ لہجے میں اس کی بات کاٹی:

"کیا تم مجھے قائل کرنے کی کوشش کر رہے ہو کہ یہ ایک اتفاق ہے؟ کہ تمہاری تصویروں میں وہ واقعہ شامل ہے جو ہمارے لیے اہمیت رکھتا ہے!"

"کون سا واقعہ؟"

اس دراندازنے اپنی شہادت کی انگلی سے اس تصویر میں ایک مقام پر اشارہ کیا اور کہا:

"یہ وہ اشتہار ہے جو ہم نے اس دن شہر کے دروازے سے اتارا تھا! کیا ایسا ہی ہے؟"

وہ فوراً اپنی صفائی میں بولا:

"میرا یقین کریں۔ میں آپ لوگوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتا اور نہ ہی مجھے آپ کے اس اشتہار سے تعلق کا پتا ہے۔ یہ تصویر میں نے ماریہ کے لیے بنائی تھی نہ کہ نمائش کے لیے۔ یہ ہماری شادی کی آنے والی سالگرہ کا تحفہ ہے۔ میں نے چاہا کہ اس کے لئے اس جگہ کو مجسم کر دوں جس میں ہم پہلی دفعہ ملے تھے۔"

اس دراندازنے دھمکی آمیز لہجے میں چڑھائی کرتے ہوئے کہا:

"کیا تم اپنی بیوی کو ملوث کرنا چاہتے ہو؟ یا جو تمھاری بیوی تھی۔"

خوف سے صالح کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں اور وہ چیخ اٹھا:

"وہ میری بیوی تھی! تم لوگوں نے ماریہ کے ساتھ کیا کر دیا ہے؟ ماریہ۔۔ماریہ!"

ماریہ کمرے میں گھس آئی اور اس پر گالیوں کی بوچھاڑ کر ڈالی۔ وہ بھڑک کر چیخی:

"جانور، غدار۔۔سب کچھ ختم ہو گیا۔ نقاب اتر چکا!"

وہ پریشان، گھبرایا ہوا کھڑا رہا۔ اس نے ماریہ کے پاس جانے کی کوشش کی تو اس دراندازنے اسے منع کر دیا اور فتح کے نشے سے بھرپور لہجے میں اسے بتایا:

"پرانے محلے میں ایک بم پھٹا تھا جس کا شکار ماریہ کے چچا اور ان کا خاندان ہوئے تھے۔ اس کارروائی کی ذمے داری ایک تشدد پسند نیلی جس کا نام 'تاریکی میں

مشاہدہ' ہے! دیکھا تم نے؟ ہمارا مقصد آنکھ جھپکنے میں پورا ہو گیا۔ کیا تمہاری آنے والی نمائش کا نام 'تاریکی میں مشاہدہ' نہیں ہے؟

صالح نے حیرت سے اسے دیکھا اور شکستہ لہجے میں بولا:

!"تم لوگوں نے اپنے اندر کی تاریکی کو ہمارے دلوں کی روشنی کو مخفی کرنے کے لیے استعمال کیا ہے! تمھیں لگتا ہے کہ میں اس کارروائی کے پیچھے تھا"

دراندازنے صالح کی طرف دیکھا جو یوں مضطرب تھا جیسے وہ پرندہ جس کی گردن پر چلنے والی چھری غلط چل گئی ہو۔ وہ تاویل دینے والے لہجے میں بولا:

"جیسے یہ مشاہدہ ایک فن ہے تو مقتاصد کا حصول بھی ایک فن ہے۔ اے فنکار! ھا ھا ھا!"

صالح کی رگوں میں خون کی گردش تیز ہو گئی اور اس کے دماغ میں ایک لمحے کے اندر ایک سے زائد منظر گھوم گئے۔ اس نے سوچا کہ ان میں سے کسی کی پستول لے اور اس دراندازپر گولیوں کی بوچھاڑ کر دیا اس کا سینہ ٹوٹے گلدان کے ٹکڑوں سے چیر دے یا نیم کھلی کھڑکی سے کود جائے"۔

اس پر ہیجان اور غصے سے سلگتی نظریں جمی ہوئی تھیں۔ اس حد تک کہ اس کے سامنے سے تمام رنگ مضمحل ہونے لگے اور اب اسے کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔

ہوا کا ایک جھونکا آیا تو کھڑکی کا ایک پٹ کھل گیا اور سورج کی پہلی پہلی کرنیں کمرے میں در آئیں۔ اس کی آنکھوں میں اپنے مخاطب کے کندھے پر لگے بیج کی چمک کا عکس پڑا اور وہ معترضانہ انداز میں چیخا:

"یہ بیج تاریخ کی تصاویر کے ساتھ چھیڑ خانی کرنے والوں کا ہے۔ تم یہاں پہنچے کیسے؟ امن و سلامتی کے ذمے داروں کو بتایا نہیں یا محلے کے کتوں نے تمھارا راستہ نہیں روکا!"

اس دراندازنے حقارت میں ڈوبی نظروں سے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا اور بولا:

"اندھی چمگادڑ کی بینائی روشنی میں لوٹ آئی ہے! شاید وہ چاہتا ہے کہ مزید مشاہدے کرے! کیا وہ کافی نہیں جو ہم نے اسے دکھا دیا ہے!"

صالح ان کے چہروں کو ایک ایک کر کے غور سے دیکھتا رہا کہ شاید وہ اس طرح اپنی قسمت کے بارے میں آگاہ ہو جائے۔ اس کی نظر اس چھوٹے سے اشتہار پر پڑی جس کی بنا پر یہ دراندازاس پر حملہ آور ہوا تھا۔

اس کی یادداشت نے اسے یاد کروادیا کہ اس اشتہار پر ایک دن کیا لکھا ہوا تھا:

جس کو کسی خطے کے لوگ اپنی سانسوں سے لکھتے ہیں اسے راہگیروں کی سیاہی مٹا نہیں سکتی۔""

اس کو ادراک ہو گیا کہ یہ دراندازاور اس کے ساتھی وہی چور ہیں جنھوں نے ایک دن اس شہر میں ڈکیتی کی تھی اور ڈرتے تھے کہ ان کی ڈکیتی کے آثار درج ہو چکے تھے۔

اس نے اپنا سر اٹھایا، اپنے ہونٹ پورے کھولے اور انہیں للکارتے ہوئے بولا:

"میری تصویروں کے ساتھ جو گڑبڑ کرنی ہے کرو۔ تاریخ ایک عبوری دور نہیں ہے۔ اس کی تصاویر سازشی ہوتی ہیں۔ جو کچھ تم تاریکی میں چھپاتے ہو وہ ایک دن روشنی میں تمھارے سامنے آسکتا ہے اور وہاں سے آئے گا جہاں تمھارا گمان بھی نہیں ہو گا"۔

فساد کی جڑ

یہ موسم گرما شدید ہے اور درجہ حرارت بلند ترین سطح تک پہنچ چکا ہے۔
مجھے اس ہوا میں دم گھٹتا ہوا محسوس ہوتا ہے جو میرے پھیپھڑوں میں داخل ہونے سے قبل اے سی کے پیٹ میں چکر کاٹ کر آتی ہے۔
میری آنکھیں غنودگی سے انکار کرتی ہیں تو میں ایک کرسی پکڑتا ہوں اور عمارت کی چھت پر چلا جاتا ہوں۔
تازہ ہوا کے جھونکے میرے چہرے سے ٹکراتے ہیں اور میری آنکھوں کے سامنے افق وسیع ہوتا چلا جاتا ہے۔
میرے لیے ستاروں کے کرشمے نمودار ہوتے ہیں تو مجھے خوبصورت تصورات میں کشتی رانی کے لیے اکساتے ہیں۔
شہر میری آنکھوں کے سامنے میرے دور افتادہ خوابوں کی مانند بکھرتا چلا جاتا ہے تو اور زیادہ ہم آہنگ نظر آنے لگتا ہے۔
اچانک وہ تضادات چھپ سے گئے ہیں جو مجھے محسوس کرواتے تھے کہ میں زیر زمین رہتا ہوں۔
میں جس محلے میں رہتا ہوں وہ پرانا ہے اور جس کو عشروں قبل تعمیر کیا گیا تھا۔ یہ محلہ اس خوبصورت شہر کے چہرے پر ایک زخم کے نشان کی طرح لگتا ہے۔
اس کی گلیاں تنگ اور باہم ملی ہوئی ہیں اور اینٹوں سے بنی منڈیریں غیر متناسب ہیں محلے سے ذرا ہٹ کر جدید رہائشی علاقے پھیلے ہوئے ہیں جنھوں نے گویا دانستہ طور پر زندگی کے تضادات کی ایک تصویر مجسم کر رکھی ہے۔

میں جہاں رہتا ہوں اس عمارت کی سات منزلوں میں سے ہر منزل میں مختلف اقوام، نسلیں اور عقائد جمع ہیں جبکہ اس کے رہائشیوں کی اکثریت ان مہاجرین کی ہے جو حالات زندگی یا اپنی خواہشات کی وجہ سے اپنے ملکوں کو چھوڑنے اور یہاں قیام پذیر ہونے پر مجبور ہوئے ہیں۔

جس وقت شہر کی بیشتر سڑکیں پر سکون ہوتی ہیں اور عمارت ہماری وجہ سے خاموش ہے اور یہ آرام کی تمنا آہستہ سے ہمارے گوش گزار کر رہی ہے، جیسے کوئی قیدی آزادی کی سرگوشی کرتا ہے۔ یہ چاہتی ہے کہ ہم اس کو اپنے شور وغل سے آزاد کر دیں۔

اب جبکہ عمارت کے رہائشی بیشتر مرد اب چھت پر ہیں۔ یہ ان راتوں میں سے ایک رت جگا ہے جب کمروں کے مکین مرد اپنے خاندانوں کے بغیر ہوتے ہیں اور چھت پر ڈومینو میزوں، تاش اور مشروبات کے گرد لگی کرسیاں بھر جاتی ہیں۔

رات کو اکثر جاگنے والے سگریٹ پیتے ہیں اور اپنے اندر کا دھواں نکالتے ہیں۔

روز مرہ کی گپ شپ بھی بذات خود مصور کی تصویریں ہیں۔

گھروں کے دروازے مصائب کے تمام مظاہر کے لیے کھلے ہیں: خستہ حالی، مالی تنگی، بے روزگاری اور بوریت ویکسانیت وغیرہ۔

جب آپ ایسی جگہ رہتے ہوں جہاں دیواریں سانجھی اور کھڑکیاں ایک دوسرے میں جھانکتی ہوں تو رازداری وہ مشترکہ ملکیت بن جاتی ہے جس میں ہر شے کھلی کتاب ہوتی ہے! آپ کا درد، آپ کی بے روزگاری، آپ کی باتیں، آپ کی خواہشات، آپ کی خوشی، آپ کا غم۔

پھر کوئی وجہ نہیں ہوتی کہ آپ اپنے حالات چھپائیں کیونکہ وہ ملتے جلتے ہی ہوتے ہیں۔ ہو سکتا ہے وہ ایک ہی ہوں جیسے کاربن کاپی ہوتی ہے۔

تسلی بھی ایک جبیی ہوتی ہے:

"اپنی مسکراہٹ کی حفاظت کرو۔ یہ تمہارے مصائب سے تمہاری واحد پناہ گاہ ہے۔"

ایک دوسری چیز بھی قابل ذکر ہے:

اسب سب کے ہوتے ہوئے وہ لمحات حذف کر دو جب عمارت کا مالک (دیم) نمودار ہوتا ہے، کیونکہ وہ عموماً اس طرح ظاہر ہوتا ہے، جیسے قدرتی آفات نمودار ہوتی ہیں تاکہ ہمیں کوئی نقصان پہنچا سکیں جن میں کم از کم نقصان ہماری ذہنی الجھن وتناؤ ہوتا ہے۔"

اس کا تازہ ترین مظہر مسز ماریہ کے عصبی نظام کا مفلوج ہونا تھا۔ مالک عمارت نے بغیر پیشگی اطلاع کرایہ دوگنا کر دیا، وہ چونکہ اسے ادا نہیں کر سکتی تھی تو مالک نے اس کے فلیٹ کا ایک کمرہ کسی دوسرے کرایہ دار کو دے دیا۔

اور ایک بدترین عذر پیش کیا کہ:"دراصل وہ تمھارے بیٹے کی عمر کا ہے۔ اس کا تم سے لگاؤ ہو جائے گا!"۔

عام طور پر اگر دیم خود نہ بھی آئے تو وہ اپنے جاسوسوں کے ذریعے ہمارے درمیان ہی ہوتا ہے۔

اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ قدرتی آفات کا خطرہ ہمیں چاروں موسموں میں لاحق رہتا ہے لہٰذا ہمیں صرف ان کی عادت ڈالنا اور ان کے ساتھ رہنا سیکھنا پڑتا ہے۔

زندگی میں کچھ انتخاب ایسے ہوتے ہیں جو وقت کے ساتھ ساتھ مقدر بن جاتے ہیں۔

اس عمارت میں ہم میں سے بیشتر کا وجود حالات کا جبر ہے اور یہ کہ ایک بہتر گھر کو کرایہ پر لینے کی سکت نہ ہونا ہے۔

اس لیے ضروری ہے کہ ساعی (عمارت کے چوکیدار) کے ساتھ یوں برتاؤ کیا جائے گویا کہ وہ اس کا کوئی ستون ہے اور ہمارے رزق کا سبب ہے۔ وہ دیم کی آنکھ ہے اور اس کا ایک لفظ ہم میں سے کسی کو بھی عمارت سے نکلوا سکتا ہے۔

"تم یہاں اپنا سینہ جلا رہے ہو اور تمہاری ماں نیچے میرے اعصاب کو جلا رہی ہے؟ اترو۔ اللہ تمھیں جہنم واصل کرے!"

سامر (نچلا پڑوسی) غصے سے چلایا تو اس کا بیس سالہ بیٹا (عدی) پیچھے کو ہٹ گیا اور اپنا سگریٹ نیچے پھینک دیا۔ اس سے قبل کہ اس کا باپ اسے مزید گالیاں دے وہ سیڑھیوں کی جانب بھاگتا ہے۔

بعد ازاں سامر کا باپ اپنے بیٹے کے ساتھیوں کی جانب بڑھتا ہے جو تاش کی میز کے گرد جمع ہیں اور تنبیہ کرتے ہوئے انھیں کہتا ہے:

"تم نے اس کو ناگ کی مانند جکڑ رکھا ہے اور اپنا زہر اس میں اتار رہے ہو۔ اگر میں نے دوبارہ تم میں سے کسی کو اس کے ساتھ دیکھا تو میں دیم کو وہ سب بتا دوں گا جو تہہ خانے میں ہوتا ہے"۔

وہ اس سے تصادم سے اجتناب کرتے ہیں تاکہ بات طوالت نہ پکڑ لے اور دوسرے لوگوں کو ان کے رازوں کی بھنک نہ پڑ جائے۔ وہ ساعی (چوکیدار) کی ملی بھگت سے اور یقیناً فروخت شدہ مال میں سے کچھ حصے کے عوض تہہ خانے میں نشہ آور گولیاں اور افیون کے ٹکڑے بیچتے تھے۔

وہ سب اس کے وہاں سے چلے جانے تک تاش کھیلنے کی اداکاری کرتے رہے۔ جیسے ہی وہ چند قدم دور گیا تو ان میں سے ایک ہینڈ فری کانوں سے نکالتا ہے اور ایک گرجتی ہوئی آواز میں کہتا ہے کہ جس سے اس موسیقی کا شور جھلکتا تھا جو وہ سن رہا تھا:

"گویا کہ وہ ہم ہیں جن کی وجہ سے وہ سکول سے نکالا گیا اور ہم نے اسے جیب تراشی سکھائی تھی! اس کے لیے بہتر ہے کہ اپنے بیٹے کو ہم سے دور کرلے۔ دراصل ہم اس کا ساتھ ترس کھا کر قبول کرتے ہیں کیونکہ وہ ایک چوہے کی طرح ہماری منتیں کرتا ہے"۔

""اس بڑے بل میں ہم سب چوہے ہی تو ہیں! ہم سب۔ ان میں سے ایک ایسے لہجے میں بڑبڑاتا ہے جس سے عدی سے اس کی نفرت ظاہر ہوتی ہے۔!

دوسرا مشروب کے گھونٹ کو اپنے منہ سے تھوکتا ہے اور واضح اکتاہٹ بھرے لہجے میں کہتا ہے:

"وہ ہمیں کس چیز کی دھمکی دیتا ہے؟ کیا وہ سمجھتا ہے کہ اگر اس نے دیم کے سامنے ہمارے راز کھولے گا تو ہم میں پھوٹ پڑ جائے گی۔ ہم تو اس عمارت کا محض ایک خالی کونہ ہیں"۔

مجھے نہیں معلوم کہ ہمیں سامر کے ساتھ جو اپنے بیٹے کو بچانے کی کوشش کر رہا ہے ایک ایسی جگہ ہمدردی کرنا چاہئے جہاں حفاظت اور سلامتی کے احساس کا داخل ہونا مشکل ہے، یا اس کے بیٹے کے ساتھیوں سے ہمدردی کرنا چاہئے جو امید کی عمر میں مایوسی کا نشہ کرتے ہیں۔

اس عمارت میں دکھ کے متعدد چہرے ہیں۔ گویا کسی بھی صورتحال میں کوئی موازنہ ہی نہیں ہے۔

یہاں آپ سوائے شکایت کے کسی بھی شے سے محروم ہو سکتے ہیں۔

اور (یہاں کا) شور تو ہماری شدت غم کا شور ہے۔

گویا ہر کوئی بات چیت کے لیے حسب معمول معرکہ آرائی شروع کر چکا ہے۔

اور حسب عادت ان میں ہارنے والی دوڑ شروع ہو چکی۔

میں اس کو اہمیت نہیں دیتا جو وہ کہتے ہیں کیونکہ میں اس کو سننے پر مجبور ہوں۔ ان کی باتیں میری مرضی کے بغیر میرے اندر گھستی چلی جا رہی ہیں۔

دیم ابھی بھی ایک ایسا موضوع ہے جسے غور سے سننا فرض ہے۔ صرف اس ڈر سے کہ کہیں آپ اس کے فیصلوں میں سے کسی فیصلے سے صرف نظر نہ کر جائیں آپ کو اسے سننا پڑے گا چاہے وہ آپ کی ذمے داری نہ ہو کیونکہ فیصلے کسی بھی وقت، کسی بھی مناسبت سے یا بلا مناسبت اس کی اپنی یا پھر ساعی (چوکیدار) کی خواہشات کے مطابق صادر ہو سکتے ہیں۔

دیم کے احوالِ زندگی ایک سے زائد مرتبہ چھت پر زیر بحث آچکے ہیں اور میں نے اس کے بارے میں متعدد کہانیاں سن رکھی ہیں۔ اب مجھے نہیں پتا کہ ان پر کس حد تک یقین کروں۔

سراج (پاکستانی) کی آواز بلند ہوتی ہے:

"مجھے وہ گوشت پوست کا انسان نہیں لگتا۔ میں نے اسے کبھی بھی بھڑکا ہوا یا غصے میں نہیں دیکھا!"

جاماجی سری لنکن ایک رنجیدہ لہجے میں اس پر رد عمل دیتا ہے:

"کون اسے غصہ دلائے؟ جب وہ سوائے پیسہ کمانے کے کوئی کام ہی نہیں کرتا! مجھے تو لگتا ہے وہ ان چونٹیوں سے بھی اجرت وصول کرتا ہے جو دیوار پر رینگتی ہیں"۔

ہمارا گیبونی ہمسایہ اس پر لقمہ دیتا ہے:

"دیم (دیمیتریوس) نام کا مخفف ہے جو کہ یونانی مصدر سے ہے"۔

بولیویائی ہمسایہ ایک لمبا قہقہہ لگاتا اور کہتا ہے:

"میں تم سے شرط لگاتا ہوں اگر اس عمارت میں کوئی ایسا ہو جو اس کو جانتا ہو"!

ہمارا فرانسیسی ہمسایہ ہماری توجہ حاصل کرنے کے لیے متعدد سیٹیاں مارتا ہے اور شرط لگاتے ہوئے کہتا ہے:

"اے لوگو، دیم کون ہے؟"

اس کا بنگالی ساتھی کہتا ہے:

مجھے لگتا ہے وہ رومانیہ سے ہے کیونکہ وہ وہاں کے رہنے والوں سے بہت ہمدردی کرتا ہے"۔

مکسیکین ہمسایہ ایک واضح ہسپانوی لکنت سے جواب دیتا ہے:

"ہمدردی کرتا ہے! وہ انھیں پائیں گودام کرایہ پر دیتا ہے۔ وہ اپنی اصلیت اور عقیدے کو ایک عجیب طریقے سے مخفی رکھے ہوئے ہے"۔

شرط لگانے والا قہقہہ لگاتا اور مزید کہتا ہے:

"میرے خیال میں اس کا سوائے مفاد کے کوئی مذہب نہیں ہے۔ اس کے پاس حالات کو جانچنے کی عجیب صلاحیتیں ہیں۔ اسے پتا ہے کہ کیسی مومن، ملحد، اشتراکی، سرمایہ دار، زاہد اور کوئی بھی شے جو آپ سوچ سکتے ہیں نظر آئے۔ میں نے اپنی زندگی میں اس جیسا متلون مزاج شخص نہیں دیکھا"۔

مجھے ایک کرخت آواز آتی ہے جس کے بولنے والے کو میں پہچان نہیں پاتا جو متاسفانہ لہجے میں کہہ رہی ہے:

"وہ جانتا ہے کہ عقائد و نظریات اپنے کے لیے آسان راستہ ہوتا ہے۔ انسان عموماً اس کے ساتھ مخلص نہیں ہوتا جو اس کے فکری انداز کو مجسم شکل نہیں دیتا۔ وہ جانتا ہے کہ کیسے اپنی انا اور تنگ نظری کی سرمایہ کاری کرتے ہیں"۔

"وہ یہ سب کچھ اپنی بوسیدہ عمارت کے پرانے فلیٹس کی تشہیر کے لیے کرتا ہے"۔

ہمارا تونسی ہمسایہ کہتا ہے:

"کسی جن کی مانند پراسرار! ہاہاہا!

شامی اس پر ردعمل دیتا ہے:

"وہ واقعی ایک جن ہے۔ کیا تم نے دیکھا نہیں کہ وہ کیسے اچانک نمودار اور غائب ہو جاتا ہے؟ میں شرط لگاتا ہوں کہ وہ سیڑھیاں اپنے پنجوں پر چڑھتا ہے تاکہ

چوری چھپے سنے اور اسے جو چیز پریشان کرتی ہے وہ ہمارا چھت پر گپ شپ لگانا ہے۔ اسے ڈر ہے کہ گاہک اس کے خلاف اکٹھے نہ ہو جائیں۔ بے شک وہ انتہائی خطرناک ہے"۔

"خطرناک! جی خطرناک"

تقریباً سبھی زبانوں نے باری باری دیم کو خطرناک قرار دیا۔ اس کی موقع پرستی، بدتمیزی، خباثت اور دھوکہ دہی کی کہانیاں بیان کیں۔ انہوں نے اس کے لیے عیبوں کی ایک فہرست کا استنباط کر لیا۔

ان کا یہ منظر بیک وقت ہنسی اور ہمدردی کا سبب بن رہا ہے۔

دیم کی شناخت کا تعین کرنے کے لیے پانچ براعظم اکٹھے ہوئے اور کامیاب نہ ہو سکے۔ ان کی بات چیت کا خاتمہ الزامات اور گالیوں پر ہی اکتفا کرنے پر ہوا!

پھر باتیں یکدم رک گئیں اور ایک خوفناک خاموشی چھا گئی۔

جیسے وہاں آوازوں کو قابو کرنے والا کوئی ریموٹ کنٹرول آ گیا تھا۔

استقبالیہ جملے پھوٹ پڑے:

"خوش آمدید مسٹر دیم!"

"عمارت منور ہو گئی"۔

"ابھی ہم آپ کے حالات زندگی پر بات چیت کر رہے تھے اور ہم نے آپ کی ہمارے معاملات میں دلچسپی لینے پر تعریف کی ہے"۔

وہ ان کے استقبال کو نظر انداز کرتا ہے اور خاموش دھمکی بھری نظروں سے ان سب کو بغور دیکھتا ہے۔ پھر کہتا ہے:

"ہم نے کتنی مرتبہ کہا ہے یہاں جلسہ کرنا ممنوع ہے! تم سب یقیناً اپنی بدنظمی سے عمارت کو منہدم کر دو گے"۔

پھر وہ کھیل کی میز کے گرد بیٹھے نوجوانوں کی جانب متوجہ ہوتا ہے اور کہتا ہے:

"یہ ایک قابل احترام عمارت ہے اور حشیش کا گڑھ نہیں ہے۔ اگلی مرتبہ میں لازماً پولیس کو اطلاع کر دوں گا"۔

ان نوجوانوں میں سے ایک عذر پیش کرنیکی کوشش کرتا ہے:

"یہ تمباکو ہے"۔

وہ بھڑک کر اس کی بات کاٹتا ہے:

"چپ کر جاؤ۔ تمھارے اور ان چوروں کے بارے میں جن کے ساتھ تم عمارت کے پیچھے مجمع لگاتے ہو میں خود اطلاع دوں گا۔ میں تم میں سے ایک ایک کو جانتا ہوں"۔

ہمائے چھت سے کھسکنے اور نیچے جانا شروع کر دیتے ہیں۔ دیم غصے میں سیڑھیوں کی طرف بڑھتا ہے اور ساعی (چوکیدار) تیزی سے اس کے پیچھے لپکتا ہے۔ ہم تک اس کی آواز کی سرگوشی الو کی چیخ کی مانند پہنچتی رہی ہے کیونکہ وہ دیم کو ہمارے خلاف اکسا رہا ہے:

"ہمیں چھت کے دروازے پر تالہ لگا دینا چاہئے"۔

دیم کی بھاری آواز اس کی تائید کرتی ہے:

"میں صبح سیہ کا کام کرنے والے سے رابطہ کرتا ہوں۔ کوئی قدم تمہاری اجازت اور موجودگی کے بغیر چھت پر نہیں رکھا جائے گا"۔

"اللہ آپ کی حفاظت کرے"۔

ساعی کی آواز خوشی سے چہک اٹھتی ہے، گویا اس نے ایک عظیم کامیابی حاصل کر لی ہو اور اس کے بعد نوجوانوں میں سے ایک کی غضبناک آواز بلند ہوتی ہے:

"یہ خسیس دیم۔ میں کسی دن اس کا سر کاٹ دوں گا۔ وہ چاہتا ہے کہ ہمیں ہوا سے بھی محروم کر دے"۔

میں اپنی نظریں روشن افق کی جانب لے جاتا ہوں اور خود سے کہتا ہوں:

"بہتر ہے کہ تم اس کی دُم کاٹ ڈالو کیونکہ کچھ سر اپنی دُم سے سوچتے ہیں"۔

ناگ کاڈنگ

"ہیلو، جی، میں وہی ہوں"۔

"مرکز روزگار برائے نوجوانان۔ آپ کو کنٹریکٹ پر دستخط کرنے کے لیے ہمارے دفتر آنے کی دعوت دی جاتی ہے"۔

ہر چیز ایک کال سے تبدیل ہو گئی۔

مایوسی کی وہ دیوار جس پر میں کسی غیر مرئی امید سے بھی زیادہ معلق تھی وہ گر گئی۔

مجھے (جدید خلا) نامی کمپنی میں کام کرنے کی ہدایت کی گئی جو ملک میں ذرائع ابلاغ کے اہم اداروں میں سے تھی۔ روزگار معنوی اعتبار سے قانونی نہیں تھا کیونکہ روزگار نوجوانان ایک ایسا نظام عمل ہے جو نوجوانوں کو معینہ مدت کے لیے معمولی ماہانہ اجرت پر نجی و سرکاری اداروں میں روزگار کے مواقع فراہم کرتا ہے۔

اس کے باوجود مجھے بہت خوشی ہوئی۔ یہ پیشہ ورانہ تجربہ اخذ کرنے اور ایک مستقل روزگار حاصل کرنے کا ایک موقع تھا۔ ظاہر ہے میرے لیے سب سے زیادہ اہم بے روزگاری سے نجات تھی۔

بیروزگاری۔

جب آپ اس کے بازوؤں سے بھاگتے ہو تو اس سے زیادہ کڑوا عمل کوئی نہیں ہوتا کیونکہ یہ بے روزگاری ہمارے اندر سے خوبصورت احساسات کو ایک ایک کر کے جڑ سے اکھاڑ دیتی ہے۔

اس کا ظلم و جبر اتنا دراز ہو چکا تھا کہ اس نے مجھ سے میرے وجود کا احساس تقریباً چھین لیا تھا۔ میں نزع کے عالم میں خود کو مضمحل ہوتا محسوس کر رہی تھی۔ بلکہ وجود محض حساب کتاب بن چکا تھا جس کا دو تضادات سے تنازع چل رہا تھا۔

ان میں سے ایک مجھ سے کہتا تھا: "افسوس کی کوئی بات نہیں، تم علم کی شہید ہو! یہی کافی ہے کہ تم نے ترقی کی راہ اختیار کی، جہاں کمتر لوگوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے"۔
دوسرا کہہ رہا تھا: "قصور! تمہارا قصور ہے! تم نے خودکشی کر لی! اگر تم نے علم کا راستہ نہ چنا ہوتا تو اب تم زندہ ہوتی اور رزق حاصل کر رہی ہوتی"۔
میں ان کے درمیان نوحہ کناں ایک تابوت (اپنی ڈگری) پر لیٹی ہوئی ہوں اور اس پر الزام کی آہ و بکا کے ساتھ لپٹی ہوئی ہوں جو کہہ رہا ہے:
"کیا تم میرے اندر کی تاریکی سے نہیں تھکتی؟ کیا تمہیں اس بات کی فکر نہیں کہ تم دوسرے معاشروں کے اپنے ہم عمروں جیسا مرتبہ حاصل کرو؟ وہاں تمہارے ہم عمر حلاء میں محل بنا رہے ہیں جبکہ تم نے یہاں قبریں کھودنے کو پیشہ اختیار کر رکھا ہے!"
اس روزگار کی پیشکش مجھے یوں آئی جیسے خشک سالی کے بعد موسلا دھار بارش آ جائے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اس کے لیے سب سے قیمتی امیدیں جمع کروں اور اپنے عزم کو بات چیت کے دوران بھی قائم رکھوں۔
اس لئے میں اس گفتگو سے مضطرب ہو گئی جو ایک صبح میں نے بس میں سنی۔ مسافروں میں سے ایک نے اپنے ساتھی سے بھاری لہجے میں کہا:
"خوش قسمتی ہے کہ بس وقت پر آ گئی ہے۔ کل یہ ایک گھنٹے سے زیادہ تاخیر سے آئی تھی"۔
اس کے ساتھی نے ایسے انداز میں تبصرہ کیا جو اس کے لہجے سے کم بھاری نہیں تھا:
"کوئی فرق نہیں پڑتا چاہے یہ تاخیر سے آئے یا جلدی کیونکہ ہمیں بنا کسی محرک اور تبدیلی کے اپنے انتظار میں وہی اکتا دینے والا منظر اور وہی سرگرمی ملے

گی۔ ایندھن اکٹھا کرنے والا ہمارا وہی پھاوڑا! ہمیں سکون سے جلانے کے لیے ہر شے تیار! کچھ نیا نہیں ماسوائے اس اکتاہٹ کے جس نے ہماری زندگیاں صرف کرنے پر گھڑی کی سوئیوں کے ساتھ معاہدہ کر رکھا ہے"۔

اس کے ساتھی نے سر جھکا اور کہا:

"روزانہ یکساں کام ملازم کو ایک قانونی مجرم میں تبدیل کر دیتا ہے۔ وہ وقت ضائع کرنے کا ماہر ہو جاتا ہے۔ وہ اس اعلانیہ عادت پر بنا کسی شرمندگی کے پیشگی ڈھٹائی اور تیاری سے عمل کرتا ہے"۔

ان دونوں کی بات چیت میرے موقف کے مطابق نہیں تھی۔ میں انتہائی پرجوش تھی اور مجھے لگ رہا تھا کہ میں بلاشبہ صحیح جگہ پر صحیح ملازم تھی۔ میں نے مختصر وقت میں کام کے تقاضوں سے آگاہی حاصل کر لی اور کمپنی کا منتظم جو اپنے کرخت، مشکل مزاج اور سختی کے لیے مشہور تھا وہ میری ہمت اور متاثر کن کارکردگی کی تعریف کرنے لگا۔

اس سے بڑھ کر یہ کہ اس نے اہم تجارتی لین دین پر عمل درآمد میرے حوالے کر دیا جو کہ مسٹر (س) کے ذمہ ہوتا تھا۔ میں نے جوش سے چمکتی آنکھوں کے ساتھ مسٹر (س) کے دفتر کا رخ کیا۔ اس نے ایسی منکسر نظروں کے ساتھ میرا استقبال کیا جو کہ اس کے جملوں کی گرمجوشی سے میل نہیں کھاتی تھیں۔

اس نے مختلف موضوعات پر گفتگو کی۔ اس نے مجھ سے اپنے دفتر میں پڑے ڈھیروں اخبارات کی سرخیوں، اپنی کیتلی کے کافی بنانیکے معیار اور کمپنی کے بارے میں بات کی لیکن فائلوں کا ذکر ہی نہ آیا۔

مسٹر (س) نائب منتظم تھا لیکن شاذونادر ہی ہم اس کو منتظم کے دفتر یا ماسوائے باورچی خانہ کے کسی اور جگہ دیکھتے تھے۔

اس کے اکثر ہمکار اس کے ساتھ میل جول رکھنے سے گریز کرتے تھے بلکہ مجھے لگتا ہے کہ میرا دفتر وہ واحد جگہ تھی جس کا وہ اس ادارے میں مجھے نئی فائلیں دینے کے لیے رخ کرتا تھا اور پھر دوبارہ مکمل طور پر اپنے دفتر میں مقید ہو جاتا تھا۔

میں ان فائلوں کا مطالعہ کرتی اور مختصر وقت میں ان پر اتنی باریک بینی سے عمل کرواتی کہ منتظم نے میری سرگرمی کے بارے میں اپنے پسندیدگی کا اظہار کرنا شروع کر دیا اور اس نے میرے ذمے مزید کام لگا دیے۔ پھر اس نے مجھے اس کمپنی میں کسی عہدے کے لئے نامزد کرنے کا وعدہ کر لیا۔

کام سے میری دلچسپی بڑھتی گئی۔ ایک پورا سال گزر گیا اور میں محنت سے کام کرتی اپنی خواہشات کے لیے جیتی رہی مگر پھر وعدہ کئے گئے منصب کو حاصل کئے بغیر ہی معاہدہ کی مدت ختم ہو گی اور مجبوراً مجھے اس جگہ دوسرے لوگوں کو الوداع کہنا پڑ گیا۔

اس کمپنی میں میرا مزید ایک دن قیام بھی اس کنٹریکٹ کی ایک اور سال کے لیے تجدید کا باعث بنا تھا اور یوں بڑے کاموں کی میری وہ ذمہ داری جاری رہتی جو نہ تو میری ادارہ جاتی حیثیت اور نہ ہی میری معمولی تنخواہ سے میل کھاتی تھی۔

میں ایک مرتبہ پھر بے روزگاری کی طرف لوٹ آئی لیکن ایک مختلف نفسیات کے ساتھ۔ میں خود کو مطمئن محسوس کرتی تھی، گویا کہ میں اپنی ادارہ جاتی حیثیت کی بہتری کے انتظار میں تھی۔ میں لوگوں کے ساتھ اور ایسے عہدوں پر کام کرنے کے اسرار کے حوالے سے اپنے کم تجربہ بیکی بنا پر منتظم کے وعدے کو سچ سمجھتی رہی اور یہ سوچتی رہی کہ میں نے کام کے دوران جن مہارتوں کا مظاہرہ کیا ہے وہ ایک کافی ضمانت ہے۔

میں اپنے اس انتظار کے باوجود جو طویل تھا خوش فہم ہی رہی۔ حتیٰ کہ عملہ میں سے ایک (ج) نے مجھے حقیقت بتائی:

"وہ عہدہ ایک رشتہ دار (ع) کے لیے مخصوص ہو چکا ہے۔ جیسے ہی وہ ڈگری حاصل کرے گا تو اسے وہاں تعینات کر دیا جائے گا"۔

اس نے مجھے سمجھایا کہ کیسے منتظم (ع) نے (س) کو الگ تھلگ کرنے پر کام کیا اور اسے ادارہ تبدیل کرنے پر مجبور کر دیا۔ کیسے اس نے اپنے مضبوط تعلقات کو استعمال کیا تاکہ وہ ملازمین کو اپنے رشتہ دار کو یہ عہدہ دینے کے لیے قائل کر سکے۔

تاریک کونوں سے خاموش چیخیں پھوٹ رہی تھیں۔

اکثر اوقات ہمارے خوابوں کے کھوکھلے پن کو عالم سکتہ کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔

میں حنوط شدہ ممیوں کے سکتہ کی طرح خاموش ہو گئی: میں کیا کہنے جا رہی تھی؟ میں کسے مورد الزام ٹھہرانے جا رہی تھی؟

میرے سامنے سوائے اپنی ناپختہ خواہشات کے اپنے غصے کا کوئی منبع نہیں تھا۔ میں خود کو حقیر محسوس کرنے لگی تھی کیونکہ میری ذاتی و موضوعی صلاحیتوں کا پلڑا منتظم کے رشتہ دار کے پلڑے کے سامنے کچھ نہیں تھا۔

(ج) بولتا جا رہا تھا اور میں دیواروں کے کونے کھدرے دیکھ رہی تھی۔ اس کے شگافوں میں چونٹیوں کے رینگنے نے میری توجہ اپنی طرف مبذول کر لی اور میں نیکر ب سے خود سے کہا:

"ان ننھی منی مخلوقات کی زندگی کتنی عظیم ہے! کوئی چیونٹی کسی چیونٹی سے رزق لینے کی خاطر اس کا تعاقب نہیں کرتی یا اس کا راستہ نہیں روکتی۔ اس بڑی سی سلطنت میں ہر کوئی اپنے رزق کی جانب ہمت اور جوش سے اجتماعی ذخیروں کی خاطر رینگتا ہے۔ جبکہ ہم اور ہمارے زمین پر رینگنے پر خون خرابہ، ظلم اور سازشوں کا غلبہ ہے۔ ہم انسانیت سے کتنے دور ہیں!"

مجھے متلی اور غلاظت محسوس ہوئی۔ میں جانتی تھی کہ وہ ملازمین محض منتظم کو راضی کرنے کے لیے (س) سے عداوت رکھے ہوئے تھے۔ وہ اسے الجھا رہے تھے، اس کی صورتحال کو پیچیدہ کر رہے تھے اور خوشامد کے ذریعے اذیت دے رہے تھے۔

جیسا کہ مجھے ادراک ہو چکا تھا کہ اس منتظم کی عداوت کا ہدف (س) نامی شخص نہیں تھا بلکہ اسے اس کی قابلیت سے دشمنی تھی۔ (س) کے پاس مخصوص سائنسی شائستگی اور اعلیٰ پیشہ ورانہ مہارتیں تھیں جبکہ منتظم اور اس کی ادارہ جاتی صلاحیتیں و طرز عمل (س) کے مقابلے میں کم درجے کا تھا۔

سچائی سے زیادہ تکلیف دہ کوئی چیز نہیں ہوتی کیونکہ وہ تب تلوار کی دھار کی مانند تیز ہو جاتی ہے۔

مجھے ادراک ہو گیا کہ میں اس منتظم کے ہاتھوں میں محض کتوں کی مانند تھی۔ اس نے مجھے اپنے راستے میں پڑے کانٹے ہٹانے کے لیے استعمال کیا۔

میں صرف ایک ملازمہ تھی جس کے پاس نوجوانان کا معاہدہ تھا۔ میرے پاس اتنا تجربہ نہیں تھا کہ میں وہ سمجھ سکوں جو ان کے مابین چل رہا تھا اور نہ میرے پاس وہ قانونی مقام تھا جو مجھے اس صورتحال پر اعتراض کرنے کی اجازت دیتا جس میں مجھے پھنسا دیا گیا تھا۔

اس نے میرے (س) کے شعبہ تخصص میں ہی اعلیٰ ڈگری یافتہ ہونے کا فائدہ اٹھایا اور میرے ذریعے اس کے ساتھ اپنے حساب برابر کیے۔ باوجود اس کے کہ وہ کام اہم تھے اور میرے پاس ان کے حوالے سے تجربہ بھی کم تھا مجھے وہ سب کام تفویض کر دیے جو (س) کرتا تھا۔

سوائے کافی بنانے اور متقاطع الفاظ والی کھیل حل کرنے کے (س) کے پاس اس کمپنی میں کرنے کا کوئی کام نہیں رہ گیا تھا۔

اس نے اسے اپنے وجود کی افادیت کے احساس سے محروم کر دیا اور اس کے ہمکاروں کی نظر میں اس کی حیثیت کم کر دی۔ ان کی اکثریت اسے ایک بیکار پرزہ کے طور پر دیکھتی تھی جو کباڑ خانے میں منتقل ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔

اس کے سست رو ادارہ جاتی موت اور قید تنہائی کا حکم نافذ کر دیا گیا۔ مجھے وہ ریتی بنا دیا گیا جو کم عقلی میں اس کی رگڑائی کرتی گئی۔

مجھے درد، ظلم اور حقارت محسوس ہوئی۔ مجھے تنہا کیے جانے کا مفہوم سمجھ آ گیا۔ وہ بے حس بچھو جو روح کا حشر نشر، عزائم کو تباہ و برباد اور امیدوں کا گلہ دبا دیتا ہے۔ وہ انتہائی گھناؤنے جرائم کا ارتکاب کرتا ہے جو انسان اور معاشروں کو منہدم کر دیتے ہیں۔

مسلط شدہ پسماندگی تنہائی کے عالم میں کاٹتی ہے۔ بغیر چیخ حقوق اور وجود کو زہر آلود کرتی ہے۔ اور جس کو ڈنگ مارتی ہے اس کے لیے اپنے درد کا اظہار کرنے کا موقع بھی نہیں چھوڑتی کہ وہ کراہ سکے۔

وہ کیا کہہ لے گا؟

"مجھے فرصت نے ڈس لیا"!

طوفان کی پھونک

"سوچنے کی کوئی بات نہیں کیونکہ عادت نے اپنی بات کہہ دی اور عقل نے اسے تسلیم کر لیا ہے"۔

میرے ذہن میں محض ایک خیال کوندا تھا۔ میں اس شہر کے مضافات میں رکنے اور نہ ہی ان میں جانے کا ارادہ رکھتا تھا لیکن اس کے داخلی راستے پر کندہ اس عبارت نے مجھے روک لیا اور جس پہلو کی طرف یہ عبارت اشارہ کر رہی تھی میں نے اس کے برعکس سوچا۔

میں نے ایک سے زیادہ مرتبہ سوچا کہ اپنے قلم کی سواری سے اتروں اور "طوفان کے شہر" میں داخل ہو جاؤں۔

مجھے نہیں پتا کہ میں نے اپنا راستہ کیسے طے کیا اور نہ ہی مجھے معلوم ہے کہ میں نے وہاں پہنچنے کے لیے کون سی سمت اختیار کی۔

جن لوگوں کو تقدیر وہاں ہانک کر لے گئی ہے ان کی زبانوں پر جاری ہے کہ یہ شہر شمار کے نقشے سے باہر ہے۔ کسی کو نہیں پتا کہ یہ کہاں واقع ہے، کیسا ہے اور اس کے باشندوں کو اس تاریخ کے علاوہ کوئی دن یاد نہیں ہے جب ان کا حکمران تخت پر بیٹھا تھا کیونکہ فراموشی کی آندھی نے ایک دن ان کو گھیر لیا تھا اور ان کی یادداشت کا صفایا کر دیا تھا۔

مگر وہ ایک بات پر متفق ہیں: "کہ طوفان کا شہر اس پر پڑنے والی نظر کی مسافت پر واقع ہے"۔

میں حیرت میں پڑ گیا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ کس مقام تک پہنچ چکا ہوں اور کتنے فاصلے سے اس کی جانب دیکھ رہا ہوں۔

میں ڈھیروں وہمات کے ساتھ اس میں داخل ہوا۔ میں نے کوشش کی کہ لوگوں کے قریب جاؤں۔ ان سے اس کے متعلق اور ان کے احول وایام بارے سوال کروں۔ لیکن انھیں اپنے ماضی کے علاوہ کسی زمانے کے حساب کتاب کا ادراک نہیں ہے۔

"...جب بھی میں کسی چیز کے بارے میں سوال کرتا ہوں تو مجھے کہا جاتا ہے:"

اس زمانے میں جب میرے دسویں دادا نے فلاں کام کیا یا جب میرے پانچویں دادا کے ساتھ یوں ہوا

ان کی زندگی کا حساب کتاب پرانی آبائی تقویم پر مبنی ہے یعنی جب ان کے قدیم آباؤ واجداد خوشحالی و علمی ترقی کے ایک دور سے روشناس ہوئے تھے جبکہ ان کا زمانہ حال شہر کے حاکم کی سانسوں سے جڑا ہوا ہے۔ نہ اس کے سانس لینے سے پہلے اور نہ اس کے اپنے پھیپھڑوں سے سانس کا اخراج کرنے کے بعد کوئی آواز آتی ہے۔

میں نے تھوڑی دیر خلا کو گھورتے ہوئے گزاری۔ جس پر بھی میری نظر پڑ جاتی وہ تیز دھارا بن جاتا۔

حقیقت کی تلاش زیادہ ضروری ہو گئی۔ میں حیرت زدہ شہر کے چکر لگاتا رہا۔ دور سے ایک سایہ میری جانب لپکا۔ اس سے پہلے کہ باقی اشیاء کی طرح وہ میری نظروں سے اوجھل ہو جاتا میں تیزی سے اس کی جانب بڑھا۔

اس سے قبل وہ دھندلکے میں کود جاتا میں نے اس کا دامن پکڑ لیا اور اسے پکارا:

"دن کے سائے"

گویا وہ جامد ہو گیا اور حیرت زدہ لہجے میں بولا:

"تم نے کیسے جانا!؟"

میں نے اسے اپنی ذہانت وفراست کی وجوہات ظاہر کرتے ہوئے کہا:

"کہا جاتا ہے کہ تم واحد ہو جو بند آنکھوں کے ساتھ طوفان میں داخل ہو جاتے ہو کیونکہ تم اپنی عقل سے دیکھتے ہو"۔

اس نے مشکوک انداز میں مجھ سے پوچھا:

"تم نے میرا چہرہ نہیں دیکھا"

میں نے اسے زور دے کر کہا:

"میں نے تمھارے آگے کی جانب لٹکے ہوئے ہاتھ دیکھے ہیں اور ایسا ردعمل عموماً اس شخص کا ہوتا ہے جو تاریکی میں اپنا راستہ تلاش کر رہا ہو"۔

اس نے غیر جانبداری سے مجھے کہا:

"تم کیا چاہتے ہو؟"

میں نے مختصراً اسے اپنا موقف بتایا:

"حقیقت یہ ہے کہ میں دیومالائی کہانیوں سے اکتا چکا ہوں"۔

اس نے حیرت سے مجھے جواب دیا:

"تم کون ہو؟"

"افکار کا صیاد"

"کیا تم درد کا شکار کرنے کی استعداد رکھتے ہو؟"

"میں ایسا کیوں کروں؟"

"کیا تم سچائی و حقیقت کا جال نہیں پھینک رہے؟"

"ابہام کو دور کرنے کے لیے کسی بھی چیز کے لیے تیار ہوں"۔

"پھر یہ کہانی اپنے دماغ میں درج کر لو۔ قلم کا کوئی فائدہ نہیں"

"کیسے؟"

"حروف یہاں تیز موجوں سے بنے ہیں۔ لکھنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ وہ موجیں اس حد تک قائم نہیں رہتیں کہ پڑھا جا سکے"۔

وہ ایک مرتبہ پھر میری طرف مڑا اور اس نے اپنی آنکھیں پوری کھولیں تو میں نے ان میں ایک بھٹکی ہوئی کشتی دیکھی جس کو لہریں ادھر اُدھر اچھال رہی تھیں۔ وہ فوراً گویا ہوا:

"ہر شے کا آغاز ایک شام کو ہوا تھا جب شہر کا حاکم موجوں کے ایک انبار پر بیٹھ گیا اور اس نے گرجدار غصے میں اپنے مشیروں کو بلایا:

اے منحوس روحو حاضر ہو جاؤ!۔ وہ سہمی ہوئی اس کے سامنے صف آرا ہو گئیں۔

اس نے ایک موٹا عصا جس پر قیمتی پتھر جڑے ہوئے تھے زمین پر مارا اور کہا:

شہر کے حالات مسلسل تنزلی کا شکار ہیں۔ جب بھی تم نے مجھے کسی ایسی چیز کا بتایا جس سے رعایا میں میری مقبولیت بڑھ جائے تو اس سے ان کی میرے لیے رت بڑھ گئی۔ میں ان کے ساتھ کیا کروں؟

انھوں نے جلدی سے اسے راضی کرنے کے لیے کہا:

اے محبت کے منبع! وہ زندہ نہ رہیں جو تمہاری موجوں سے نفرت کرتے ہیں۔

وہ دوبارہ گرجا:

رعایا کی حالت اچھی نہیں ہے اور تم اپنی ہنگامہ آرائی میں مشغول ہو!

انہوں نے خوف زدہ نظروں کا آپس میں تبادلہ کیا اور خزانہ کے منتظم سے بولے کہ وہ ان کا دفاع کرے کیونکہ وہ ان میں سب سے زیادہ حاکم کا مقرب تھا۔ وہ پریشانی کے عالم میں بولا:

ہمارے آقا ہم نے ان کو روزے رکھوا دیے۔ آپ کے حکم کے مطابق ہم نے ان کو ایک مدت کے لیے کھانے پینے سے منع کر دیا۔ پھر ہم نے ان کے لیے کچھ دانے بکھیر دیے۔ وہ ان کو مرغنیوں کی مانند چننے میں مصروف ہیں۔

حاکم باقی مشیروں کی جانب مڑا تو وہ سمجھ گئے کہ وہ ان سے اپنے اپنے فرائض کی بابت پوچھ رہا ہے۔

امور داخلہ کے منتظم نے جلدی سے وضاحت دی:

ہم نے پسو اور جوئیں پھیلا دی ہیں تاکہ وہ خارش سے لڑتے مرتے رہیں۔

اور تفریح کے منتظم نے کہا:

ہم نے ان کے لیے ایک عجیب سرکس کھول دی ہے جس میں درندوں کو سدھائے ہوئے پالتو جانوروں کے ساتھ اکٹھا کر دیا گیا ہے۔ اور یہ حقیقت میں ایک ہنسی مذاق تھا۔۔۔

حاکم نے اپنے ہاتھ کے اشارے سے اسے بات کرنے سے روک دیا اور ساتھ ہی بھڑک کر بولا:

کیا تم سب کو ادراک ہے کہ اگر ان کو طوفان کے خیالات آنا شروع ہو گئے؟ وہ اس کی شکل و رنگ اور افادیت کے بارے میں سوال کرنے لگے ہیں۔ وہ شہر کے رازوں پر مباحثہ کرنے لگے ہیں۔ وہ سوچ رہے ہیں! اور میں اس بات کی ضمانت نہیں دے سکتا کہ ان کا تخیل انہیں کہاں تک لے جائے گا... وہ بغاوت کر سکتے ہیں.. یہ ایک مصیبت ہے!

سانسوں کی منصوبہ بندی کے منتظم نے حاکم کو مطمئن کرنے کی کوشش کی:

"صرف افکار سے؟"

حاکم نے گرجتے ہوئے اس کی بات رد کر دی:

میں آج کے بعد سوچ کے بارے میں کوئی چیز سننا نہیں چاہتا۔ مجھے مکمل سکون چاہیے۔

مشیروں نے جلاد کے ہاتھ میں اچھلتی تلوار کی طرف دیکھا اور دہشت کو اپنی گردنوں میں محسوس کیا۔ وہ سہمے ہوئے وہاں سے نکل گئے اور اس مہلت کے ختم

ہونے سے قبل جو اس نے مقرر کی تھی..... یعنی غروب آفتاب..... وہ اپنے حاکم کے دربار کو لوٹ آئے۔

مشیر بادشاہ کے پاس شہر کا کاہن لے کر آئے جو اپنے مالک کے تصور و خیال کے مطابق طوفان برپا کرنے میں مہارت رکھتا تھا۔ اس نے طوفانی حاکم کے تخت کے گرد ایک دائرہ کھینچا اور پھر کہا:

جو کوئی بھی آپ عالی مرتبت کے لیے پریشانی کا باعث بننے کی کوشش کرے گا، میرے پاس اس کے لیے زمانے بھر کے مصائب ہیں۔

حاکم کے چہرے پر تجسس کے تاثرات ابھر آئے اور وہ بولا:

خبردار! میں کاہنوں کی خیال آرائیوں میں نہیں آتا۔

میں آپ کے لیے ثبوت لے کر آیا ہوں۔ اس آلہ کو اس کے موجد نے بطور امانت میرے پاس چھوڑا تھا لیکن آپ تو تمام امانتوں کے مالک ہیں۔ اس موجد کو شدید اضطراب کے دورے پڑتے تھے۔ وہ ڈرتا تھا کہ کہیں اس کی ایجاد غلط ہاتھوں میں نہ چلی جائے۔ اس وہ یہ لے کر میرے پاس آیا کہ میں اس کو طوفانی لہروں میں تبدیل کر دوں تو میں نے اسے محفوظ کر لیا کیونکہ مجھے اندازہ تھا کہ وہ دن آئے گا جب یہ ایجاد آپ کے کام آئے گی۔

حاکم کی متشکک نگاہوں نے آلہ کے گرد چکر لگائے تو کاہن نے فوراً وضاحت دی:

یہ عین معیار کے مطابق ہے۔

حاکم نے قدرے پریشانی سے کہا:

طوفان کے معاملات میں معیار کا کیا کام؟

کاہن طنزیہ مسکراہٹ سے مسکرایا اور اعتماد سے بولا:

"مکمل سکون"

تجسس نے حاکم کو اپنی گرفت میں لے لیا اور اس نے عجلت سے اس بات کی وضاحت مانگی:

کھل کر بتاؤ

اکثر اوقات خیالات ہی پریشانی کا منبع ہوتے ہیں اور بچے دراصل روز افزوں خیالات ہی تو ہیں۔ یہ آلہ ان کے افکار کی کانٹ چھانٹ کر کے ان کو خالصتاً آپ کے لیے بنا سکتا ہے۔

بزرگ ترین مشیر کو اندازہ ہو گیا کہ حاکم کا صبر ختم ہونے والا ہے۔ اس لیے اس نے وضاحت کے لیے مداخلت کی:

اس کاہن کی تجویز ہے کہ ہم شہر کے بچوں کو جمع کریں اور ان کے دماغوں کو اس آلہ سے منسلک کر دیں تاکہ یہ ان کے ذہنوں کا رس چوس لیا اور اسے آمیزش کرنے والی مشین میں اکٹھا کر دے۔ پھر اس آمیزش کا مطلوبہ معیار کے محلول کے ہمراہ انجیکشن لگا دیا جائے جو ان کے دلوں میں حاکم کی وفاداری کو راسخ کر دے گا اور اس تخلیق کو ان دماغوں میں مختلف تناسب سے ڈالا جاتا رہے گا تاکہ ان کے وجود کا تشخص کسی حد تک قائم رہے۔

بعد ازاں وہ حاکم چل بسا اور اس کے بعد اس کا بیٹا پھر اس کا پوتا جانشین بنے جنھوں نے باری باری دقیانوسی معیار کا آلہ استعمال کیا۔ شہرِ طوفان قبرستانوں جیسی خاموشی سے روشناس ہو گیا۔ نہ کوئی خیال اور نہ ہی کوئی جھگڑا۔ وہ بھی اس حد تک کہ جس کا گمان بھی نہیں تھا۔

دماغ کو خالی کرنے کے آپریشن کے دوران ایک بچے کے دماغ کے جوڑوں پر زد آئی اور دماغی محلول کی نالیوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ ہوئی تو سروں میں ایک جیسی مقدار بھر دی گئی جس کا نتیجہ ایک ایسی نسل تھی جس کے ایک جیسے افکار اور رجحانات تھے۔

اس بات کی تصدیق تب ہوئی جب شہر کے تمام نوجوان شہر کی عورتوں سے اجتناب کرنے لگے اور سب کے سب ایک ایسی اجنبی عورت سے شادی کے متمنی ہو گئے جو شہرِ طوفان کی سرحد پر رہتی تھی۔

اس کی خاطر ان کا باہمی مقابلہ شدت پکڑ گیا اور ان میں جھڑپیں، لڑائیاں، فادات، تشدد شروع ہو گیا۔ اگر حاکم وقت مداخلت نہ کرتا اور قرعہ ڈالنے کا حکم نہ دیتا تو قریب تھا کہ معاملات خاندانوں، گلیوں اور محلوں میں جنگ کی صورت اختیار کر لیتے۔

بالآخر قرعہ ایک ایسے شخص کے حق میں نکلا جس نے لڑائی میں حصہ ہی نہیں لیا تھا۔ وہ اپنے حجرے میں محض تمناؤں اور دعا پر مطمئن تھا کیونکہ وہ ایک زاہد تھا اور اپنے رب کی عبادت میں مشغول رہتے ہوئے اپنے محلے کے لڑکوں کو اخلاقیات کے درس دیتا تھا۔

قرعہ کے نتائج اس عورت کی پسند کے نہ نکلے اور وہ شہر چھوڑ گئی۔ لوگوں نے اسے ہر جگہ ڈھونڈا تو انہیں آشکار ہوا کہ وہ کوئی فرشتہ نہیں تھی جس کا ذکر وہ اپنے اشعار میں کرتے تھے۔ وہ تو ایک طوائف تھی جسے راہزنوں نے خبریں حاصل کرنے کے لیے ان کے درمیان گھسایا تھا۔

"اس خبر نے شہرِ طوفان میں ایک جھگڑا کھڑا کر دیا اور ان نوجوانوں نے اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ "مشاہدے کے اختلاف" کو پہچانا۔ ان میں سے کچھ سمجھتے تھے کہ وہ شہر میں اس زاہد کی حیثیت کو برقرار رکھنے کے لیے وہاں سے بھاگ گئی جبکہ کچھ کے خیال میں وہ اس کی زاہدانہ زندگی سے نفرت کرتی تھی باقیوں نے فرض کر لیا کہ وہ اس کے علاوہ کسی اور کی طرف مائل تھی۔ ان کے افکار متصادم تھے مگر ان میں سے کسی نے بھی اس عورت کے ساتھ اس وقت کے تعلق کے بارے اپنا موقف نہیں دیا جب وہ ظاہر ہوئی تھی"۔

""دن کے سائے نے اپنی گفتگو روکی اور مجھے اس سوال سے ششدر کر دیا:

"تم کیسے بچ گئے؟"

میں نے الجھن سے اسے جواب دیا:

"میں تمہارا مقصد نہیں سمجھا"۔

اس نے اپنے بخارات زدہ ہاتھوں سے میرا چہرہ چھوا اور کہا:

"دن کا سایہ" کو سوائے دقیانوسی محلول سے بچ جانے والوں کے علاوہ کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تمھارے افکار اختلاف رائے سے لبریز ہیں۔ تمھاری یہاں واپسی میں تمھارے لیے خطرہ ہے"۔

جنونی وہمات نے مجھے آن گھیرا۔ میں نے گھبرا کر اس سے پوچھا:

"میں کون؟"

وہ سایہ طوفان کی کثافت میں غائب ہو گیا اور مجھے ایک بت کی مانند جامد چھوڑ گیا۔

میرا قلم ورق سے ایک فاصلے پر رک گیا۔

میرے لیے انتخاب کرنا مشکل ہو گیا کہ میں حقیقت کو طوفانی دھاروں میں ان شکست خوردہ لوگوں کے دقیانوسی خیالات سے مسخ چھوڑ دوں جو طوفان کے روبرو وقت، کوشش اور عمر کا ضیاع کرتے ہوئے افکار کے میدان میں اترنے سے خائف ہیں۔

اس وقت سے میں حیرت زدہ ہوں۔ میں طوفان کے شہر میں داخل ہونے کی جرات نہیں کر سکتا اور نہ اسے بھول سکتا ہوں۔

آپ کی کیا رائے ہے؟ کیا میں واقعی "شہرِ طوفان" کا باسی ہوں؟ یا دن کا سایہ مجھے طوفان کی پھونکوں سے دھوکا دے رہا ہے تا کہ وہ میرے سوالوں سے بچ جائے۔

میرا سوال طوفان سے بچ جانے والوں کے لیے ہے۔

ہوائی وبر آبی باتیں

صحوان بے چینی سے سڑکوں پر گھوم رہا تھا۔
اس نے گاڑی کی رفتار کم کی اور دائیں بائیں دیکھنے لگا۔
اس نے اپنی نظریں انتخابی امیدواروں کی تصاویر پر گھمائیں جو ہر جگہ دیواروں، دروازوں، درختوں، پتھروں، گاڑیوں اور ستونوں پر بکھری ہوئی تھیں۔
اسے لگا کہ جیسے ان میں کوئی چیز تبدیل ہو چکی ہے لیکن وقت نے اسے اجازت نہیں دی کہ وہ اس کی قریب سے تصدیق کر سکے۔
صبح کے آثار ابھی پوری طرح واضح نہیں ہوئے تھے اور وہ ابھی تک غنودگی جیسی کیفیت میں گم نظر آتی تھی۔
انتخابات کے مقررہ وقت سے کچھ روز قبل نعمان اچانک غائب ہو گیا تھا۔ صحوان کو ڈر تھا کہ شاید وہ اپنی رائے بدل لے گا کیونکہ اس نے مشکل سے خود کو قائل کیا تھا کہ وہ (نہیں-ہاں) نامی جماعت میں شامل ہو جائے اور علاقہ ناظم کے انتخابات میں اس کا امیدوار بن جائے۔ اسی طرح جتنا صحوان کے بس میں تھا اس نے جماعت کی قیادت کو اس کی نامزدگی قبول کرنے پر آمادہ کیا تھا۔ اس امر کو اس کی تین خصوصیات نے مزید تقویت بخشی تھی:
"وہ اس حد تک امن پسند تھا کہ مکھیاں بھی اس کی رفاقت سے مانوس ہو جاتی تھیں؛ اونچے خیالات تو اس کی پیدائش کے روز ہی غائب ہو گئے تھے حتیٰ کہ آئینہ کے سامنے بھی اس کے کوئی تاثرات نہیں ہوتے تھے"۔
قصہ مختصر یہ کہ تنگ دستی و مشقت کی وجہ سے نعمان نے اپنی پڑھائی مکمل کرنے کا ارادہ ترک کر دیا اور اپنے گھر کے قریب ایک کارخانہ میں تنخواہ پر رات کے وقت بطور چوکیدار کام کرنے کو ترجیح دی۔ وہ ایک رات کام اور دو دن آرام

کرتا تھا۔ وہ اپنا بیشتر وقت اپنے بستر پر دراز ٹی وی پروگرام دیکھتے ہوئے گزارتا تھا۔ اس کا اصل نام نعیم تھا مگر لوگوں نے نعسان کی کنیت اس لئے اسے دے دی کیونکہ وہ کسی وجہ سے بی اے کے امتحان کے دوران سو گیا تھا اور تب تک نہیں جاگا جب تک گھنٹی نہیں بج گئی۔

اکثر لوگوں کے نزدیک وہ نیند کے علاوہ کسی کام کا نہیں تھا۔ اس لئے ان کو حیرت ہوئی جب صحوان نے جو کہ اپنی ذہانت اور پھرتی کی وجہ سے مشہور تھا اس کو محلے کی کمیٹی کی سربراہی کے لیے امیدوار نامزد کیا بلکہ صحوان اس کے پیچھے ہی پڑ گیا کہ وہ اس پیشکش کو قبول کرلے اور اسے اس بات کا احساس دلایا کہ وہ اپنی مشکلات اور ابتر حالات کے حل کے منتظر اہل محلہ کا انتخاب دہندہ ہے۔

نعسان کو لگا کہ وہ یکایک ایک عجیب اور اجنبی دنیا میں آ گیا ہے جس کے ساتھ نپٹنا وہ نہیں جانتا۔

جب جماعت کے ارکان نے اسے کہا کہ انتخابی پروگرام کا تصور پیش کرو تو وہ الجھن میں پڑ گیا۔ اس نے گھنٹوں حیرانگی سے اپنے سامنے پڑے ورق کو گھورا اور پھر صحوان سے رابطہ کیا اور اسے کہا:

"میری پیدائش سیاست کے لیے نہیں ہوئی ہے۔ میرے لیے بہتر ہے کہ میں اپنی پر سکون زندگی کی طرف لوٹ جاؤں کہ میں جب چاہوں اٹھوں، جب چاہوں سو جاؤں۔ مجھے ٹی وی پروگرام دیکھ کر لطف آتا ہے"۔

صحوان نے فوراً اس کو مطمئن کیا:

"یہی تو درکار ہے۔ اس چیز میں سرمایہ کاری کرو جو تمہیں پسند ہے اور جو تم جانتے ہو۔ مثال کے طور پر تمہارے لیے ممکن ہے کہ تم اپنے افکار کسی بھی ایسے ٹی وی پروگرام سے اخذ کرلو جو تمھیں پسند ہو"۔

"مجھے خاموش مزاح پسند ہے"۔

"زبردست! اس میں سے کوئی بھی خیال جو تمہارے ذہن میں آئے اسے اخذ کرلو"۔

اس نے قدرے شک سے صحوان سے کہا:

"کیا یہ جائز ہے؟"

صحوان زور دے کر بولا:

"بالکل جائز ہے۔ تمھارا کیا خیال ہے؟ سیاست ایک ہوائی و بر آبی مخلوق ہے جو کسی بھی ماحول میں سانس لے سکتی ہے اور کسی بھی مؤقف سے اپنا جواز حاصل کر لیتی ہے۔ تمھیں صرف تالیوں اور خواہشات کی کم مائیگی سے فائدہ اٹھانے میں مہارت پیدا کرنا ہوگی"۔

نعسان نے بے بسی سے کہا:

"مجھے نہیں لگتا کہ میں کامیاب ہوپاؤں گا۔ میری آپ سے گزارش ہے کہ مجھے اس مشکل کام سے معاف ہی رکھیں"۔

صحوان نے اصرار کیا:

"نہیں تم ضرور کامیاب ہوگے۔ اہل محلہ کے لئے یہ تم پر فرض ہے اور جب متعدد لوگوں نے تم پر اعتماد کرلیا ہے اور وہ تمہارے افکار پر یقین لے آئے ہیں تو تمہیں حق نہیں کہ تم پیچھے ہٹ جاؤ۔ امیدیں دلا دینے کے بعد پیچھے ہٹ جانا شرمناک عمل ہے بلکہ ان لوگوں سے خیانت ہے"۔

بھاری اور گونجدار اصطلاحات نے کام کیا اور نعسان پر اثر ہوگیا۔ اس نے انتہائی جوش سے انتخابی مہم شروع کردی۔ جس کا آغاز اس نے ایک مختصر برجستہ خطاب سے یہ کہتے ہوئے کیا:

"عزیز اہل محلہ!

تہذیب کا اندازہ فرد کی دوسری مخلوقات کے ساتھ جو کسی بھی قسم کی ہوں بقائے باہمی کی نوعیت سے لگایا جاتا ہے۔

کوئی بھی مخلوق ایسی نہیں ہے جس کے کسی پہلو سے فائدہ نہ حاصل کیا جا سکتا ہو۔

ہمارے لیے مکھیوں اور شہد کی مکھیوں میں مثال ہے، اول الذکر ہمارے تعفن کا ذائقہ جانتی ہیں اور دوسری سے ہم شہد کھانے کے لیے مانگتے ہیں۔

ہماری زندگی دراصل تعفن اور شہد کے معاملات ٹھکانے لگانے پر کھڑی ہے۔

اگر آپ اس حقیقت کے مطابق واضح طور پر زندگی گزارنا چاہتے ہیں تو مجھے منتخب کریں"!"

اس کیارد گرد تالیاں گونج اٹھیں اور جماعت کے بیشتر ارکان نے اس کے افکار کی تعریف کی۔ جماعت کے سربراہ نے حیرت زدہ پسندیدگی سے کہا:

"!یہ ہوتا ہے وژن"

حوصلہ افزائی نے اسے خوش اور پُرجوش بنا دیا۔ بعد ازاں بھی اس کی تقریریں اور سرگرمیاں جاری رہیں۔ وہ دن رات اپنے افکار کی ترویج میں مشغول ہو گیا لیکن کچھ عرصے بعد جو وہ کر رہا تھا اس میں اس کی دلچسپی کم ہو گئی۔ اسے اکتاہٹ اور تھکاوٹ محسوس ہونے لگی۔ وہ اکثر ناگواری سے کہنے لگا:

"میں بندوں کے حیلوں بہانوں سے اجتناب کیا کرتا تھا اور اب میں حشرات کے فضلے میں غرق ہو چکا ہوں"۔

اے نعسان تم پر لعنت ہو! وہ تم میں سے غنودگی کی لذت نکال باہر کرنے میں کیسے کامیاب ہو گئے؟

"اب تمھیں نیند جبراً آتی ہے۔ ایک وہ وقت تھا جب وہ تابعداری و اشتیاق سے آتی تھی اور اب اسے نیند کی گولیوں سے گھسیٹ کر لانا پڑتا ہے"۔

اسی حال میں اسے تین دن گزر گئے اور وہ نظر نہ آیا اور نہ ہی جماعت کے ارکان کی کالوں کا جواب دیا۔

صحوان نے اسے ہر جگہ ڈھونڈا مگر وہ نہ ملا۔ اسے فکر ہونے لگی اور وہمات آنے لگے۔ اس نے کئی ممکنات کے بارے میں سوچا: کہ وہ بھاگ گیا ہوگا، اس نے جماعت تبدیل کر لی ہوگی، اسے اغوا کر لیا گیا ہوگا، یا وہ اس سے جان چھڑا چکا ہے۔ اس کا منظر عام پر نہ آنا (نہیں-ہاں) جماعت کے معاملات کو خطرے سے دوچار کر رہا تھا۔ وقت اس بات کی اجازت نہیں دیتا تھا کہ کوئی دوسرا امیدوار نامزد کیا جائے۔

نعسان نے جماعت میں اختلافات کی چنگاری بھڑکا دی۔ اس میں کچھ لوگ اس کی نامزدگی کی حمایت کر رہے تھے جبکہ کچھ اس پر معترض تھے۔ صورتحال بگڑ گئی اور صحوان ایک مخمصہ میں پڑ گیا کیونکہ نعسان کی نامزدگی اسی نے کی تھی۔ اس کے اعصاب مضطرب رہنے لگے۔ وہ سوتا تو اس امید پر کہ نعسان اس سے رابطہ کرے گا وہ اپنا فون اپنے ہاتھ میں رکھتا۔

آخر کار صحوان نے اس سے خود ہی رابطہ کر لیا۔

فون کے ذریعے نعسان کی آواز اس تک ایسی پہنچی جیسے خشک سالی کے بعد بارش آتی ہے۔ اس نے اسے پوچھا:

"!تم بستر میں ہو؟ صحیح"

نعسان نے دھیمی آواز میں کہا:

"پولیس کے بستر میں"

صحوان نے فوراً نتیجہ اخذ کیا:

"!کیا تم غلط جگہ سو گئے تھے؟ میں نے تمہیں متعدد مرتبہ متنبہ کیا ہے کہ نیند کی گولی اپنے گھر سے باہر نہ استعمال کیا کرو"

نعسان نے بھاری لہجے میں کہا:

"میں یہاں اس لیے ہوں کیونکہ میں صحیح جگہ پر سویا تھا"۔

صحوان پریشانی کے عالم میں اس کی طرف روانہ ہو گیا۔ دھوپ کی کرنیں ہر جگہ بکھر چکی تھیں اور انہوں نے اس کے لئے وہ عیاں کر دیا تھا جسے تاریکی نے اس سے چھپا رکھا تھا۔

اس کی نظریں امیدواروں کی عجیب تصاویر پر گھوم رہی تھیں۔ وہ اسے انوکھی مخلوقات لگ رہے تھے۔ ان کے تاثرات ہر تصویر میں شہد اور تعفن کے مطابق بدل چکے تھے۔

صحوان کو لگا کہ اس کا دماغ اس کے روبرو گر گیا ہے اور وہ عقل کے کل پرزوں سے مدد مانگ رہا ہے۔

وہ سمجھ گیا کہ اس کا سبب نعسان ہے۔ جیسے ہی وہ تھانے پہنچا تو اس نے نعسان کو قمیض سے پکڑا اور بھڑک کر بولا:

"تم امیدواروں کی تصاویر کو کیسے اتنے بدبودار طریقے سے مسخ کر سکتے ہو؟! تم نے جو کیا ہے کیا تمہیں اس کے نتائج کا ادراک ہے؟"

نعسان اس کے سامنے ایک بوسیدہ چیتھڑے کی طرح ہزیمت سے کانپ رہا تھا اور چپ تھا۔ اس کی خاموشی نے صحوان کو مشتعل کر دیا اور وہ گالیاں بکنے لگا۔ اس نے جذباتی ہو کر اسے کہا:

"اگر ان امیدواروں نے کوئی مقدمہ دائر کر دیا تو کیا تمہیں ان نقصانات کی نوعیت کا اندازہ ہے جو جماعت کو اٹھانا پڑ سکتے ہیں؟ اگر تمہارے جیل میں رہنے سے جماعت کی ساکھ کو نقصان نہ پہنچ رہا ہوتا تو ہم تمہیں اس وقت تک نچوڑنے دیتے جب تک خون تمہاری جلد سے غائب نہ ہو جاتا اور تم اپنی نیند میں بھی اپنے حقیر فضلات و سوائل کی چسکیاں نہ لینے لگتے"۔

نعسان نے اپنا سر اٹھایا اور تھکی مرجھائی ہوئی نظروں کو صحوان کی آنکھوں پر ثبت کرتے ہوئے کہا:

"میں نے جماعت کے قواعد وضوابط کی پابندی کی ہے۔ میں نے تعفن اور شہد ایک مخصوص مقدار میں اپنی خواہش کے مطابق تقسیم کیا۔ پھر میں نے تصاویر کے مالکان سے رابطہ کیا اور ان کی خواہش کے مطابق انہیں اس کو ختم کرنے میں اپنی مدد کی پیشکش کی تھی۔ کیا یہ ہوائی وبر آبی نہیں ہے؟"!

صحوان کی نظریں اس خواہش سے چمک اٹھیں کہ وہ نعسان کو زمین کے کرہ ہوائی سے اٹھا کر باہر پھینک دے۔ اس کے گالیاں دینے والے ہل جیسے حرکت میں آ گئے۔ اس کا وہ غصہ جس کو اس نے بمشکل روکا ہوا تھا قابو سے باہر ہو گیا۔ اس نے اپنے دانت پیسے اور قدرے تحکمانہ انداز میں نعسان سے کہا:

"اپنی زبان کو ان گولیوں کے ساتھ نگل جاؤ جو تمہارے لیے جماعت کے ڈاکٹر نے تجویز کی ہیں! سو جاؤ جتنا سو سکتے ہو اور ہمیں اپنا تعفن بیدار کرنے دو! اپنے واحد طرۂ امتیاز سے فائدہ اٹھاؤ!"۔

مختلف منظر نامہ

صبح کا سورج ایک نئے دن کے ساتھ طلوع ہوا۔
جس نے حلیمہ کے مدرسہ (علامہ) میں تدریس کے سات سال مکمل کر دیے۔
اس نے اپنی عادت کے مطابق تختہ سیاہ پر نقشہ ایک ایسے حاکم کی طرح نصب کیا جو اپنی حاکمیت کی نمود و نمائش پر نازاں ہو۔
جس مدرسہ میں وہ بڑی ہوئی تھی اس کی یادگاروں اور مدرسہ کے وہ مجسم شواہد جو اب اس کے سامنے تھے ان کے مابین فرق ظاہر ہونے کے بعد بھی اس کے دل میں نقشوں اور تاریخی یادگاروں کی چمک دمک کم نہیں ہوئی تھی۔
اس کے خوابوں کا زمانہ اس تختہء سیاہ سے واقف نہیں تھا جس پر مار کر رولر جوتوں کی مانند پھسلتا ہے، اور نہ ان الفاظ سے آگاہ تھا جو دیوار پر قوس قزح جیسا رقص کرتے ہیں اور نہ ہی نیم نصابی کتابوں کی الماریوں کو جانتا تھا۔ نہ ہی تب الیکٹرونک لائبریریاں تھیں لیکن کسی کے مقام و منزلت کے لوازمات کا پاس رکھنا مسلمہ حقائق میں شمار ہوتا تھا: یعنی یہ استاد کی جگہ ہے، یہ طالب علم کی جگہ ہے اور یہ مدرسہ کی مخصوص علامات و شواہد ہیں!
اس مقام کی ایک گمراہ کن چمک تھی۔ جس نے اس کی طرف لوٹنے اور اسی کرسی پر بیٹھنے پر اسے اکسایا مگر کرسی نے اس تپاک سے اس کا استقبال نہیں کیا جس کی وہ متمنی تھی۔
مثال کے طور پر اگر وہ متنبہ نہ ہوتی کہ ایک طالب علم نے پیچوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کر رکھی ہے تو قریب تھا کہ وہ کرسی سے گر جاتی۔ وہ در گزر کے انداز سے مسکرا دی۔ اس نے اسے پہلے دن کا مذاق سمجھ لیا لیکن اس نوع کے مذاق بار بار ہوئے

اور ان کی اقسام بھی بڑھتی گئیں۔ بچوں والا کھیل تعلیم و تربیت اور مدرسہ کے انتظام تک وسیع ہوتا چلا گیا۔ توڑنے اور جوڑنے والوں میں تنوع آتا گیا۔

وقت کے ساتھ ساتھ اسے لگنے لگا کہ تاریخ کا مضمون جوئے کی ایک بڑی میز ہے جس نے مختلف مصادر اور اعتراض کی خواہشات کا ایک وسیع دائرے کا احاطہ کر رکھا ہے: کون چاہتا ہے کہ اپنے اداری لائحہ عمل کی خالی جگہوں کو ان زخم کے نشانوں سے پر کرے جنھیں وہ نصابی پروگرام کا نام دیتا ہے، کون تاریکیوں کو عقل کے لیے وا کرنا چاہتا ہے اور ڈگریوں کی اسٹاک ایکسینج کو کس کی تلاش ہے... اور کون... اور کون۔ مقاصد متنوع ہیں مگر ہدف ایک ہی ہے۔ وہ ہے مستقبل اور طلباء کے ذہن۔ وہ چونکہ اٹھی کہ متعدد جہات ہیں جو ان ذہنوں کو اپنی خواہشات اور مقاصد کے مطابق ڈھالنا چاہتے ہیں۔

افعال متنوع ہیں مگر مفعول ایک ہی ہے اور وہ ہے علم: ایک مرتبہ اسے منتظم نے درسی نصاب سے خارج مضمون سے حیران کر دیا؛

ایک دفعہ اس سے اساتذہ نے مطالبہ کیا کہ وہ ایک مضمون کو نظر انداز کرے؛ اور ایک مرتبہ طلباء کے والدین نے مداخلت کی کہ ایک مخصوص فکر و خیال کو دور رکھا جائے یا ان کے بچوں کی غلطی سے غفلت برتی جائے؛ ایک دفعہ اسے ایک فوری ادارہ جاتی فیصلہ سے حیرت ہوئی کہ درسی سال کے نصف میں درسی نصاب کے ایک مضمون کو تبدیل کر دیا گیا۔ یہ ان کوششوں کے علاوہ ہیں جو تعلیمی میدان یا اس کے باہر سے کچھ جہتیں کرتی ہیں۔

اس کے خطرے کا احساس بڑھتا گیا۔ وہ عین دن کے وقت ڈراؤنے خواب دیکھنے لگی۔ اسے لگنے لگا کہ مدرسے کے تہہ خانے میں مہلک ہتھیار چھپا کر رکھے گئے ہیں جو پورے شہر پر زہریلی اور بارودی ہوا سے بمباری کرنے کے لیے کافی ہیں تاکہ فکری طوائف الملوکی پھیل جائے لہٰذا اس پر ایک تیز سوال دھاوا بولتا ہے: "اگر

زبانوں کا توازن بگڑ گیا تو کیا ہوگا؟ جیسے رموز اوقاف کے مابین تنازع کھڑا ہو جائے تو علاماتِ تعجب واستفہام اور فاصلہ ایک دوسرے کو سینگ ماریں گے، قوسین باہم الجھ پڑیں گی اور حرکات تو ضائع ہو جائیں گی؛ نہ جزم، نہ پیش، نہ زبر، نہ ہی کوئی زیر اور متن کا سارا وجود علامت وقف تک محدود ہو جائے گا"۔

"!سوچ کی روشنی اپنے راستوں کی تاریکی کو ختم کرتی ہے"

اس قدیم ذخیرہ کے سوا اس کے پاس کچھ نہیں بچا تھا جو اسے مضبوط کیے رکھتا تھا۔ ایک ایسی جادوئی عبارت جس کو اس کا گرویدہ مریض دہراتا رہتا ہے۔ اس کی کہانی اس کے وجدان میں گہرائی تک نقش ہو چکی تھی۔

سالوں تعلیم وتدریس کے بعد استاد فارس نے دو بنیادی باتیں اس کے سامنے اخذ کی تھیں:

"معاشرے کی بیشتر مشکلات اس کے روبرو مدرسہ کی پریشانیوں سے کشید ہو کر آئی تھیں۔ نصابی مضامین ہی مدرسہ کی بنیاد ہیں"۔

فارس نے برسوں تدریس کا نچوڑ ایک تحقیقی مقالہ کی شکل میں پیش کیا۔ اس نے اسے تحریر کرنے میں کئی سال لگائے اور پھر متعلقہ ادارے کا ردعمل بھی اسے برسوں بعد ملا جب تمام طبی رپورٹس نے تفصیلاً اس کی صحت بیان کرتے ہوئے اس بات کی تصدیق کر دی کہ اس کی بصارت ناقابل فہم کمی کا شکار ہو چکی ہے۔

وہ حروف کے مابین ٹھیک فرق نہیں کر رہا تھا مگر وہ اپنے آپ کو تعلیم وتدریس ترک کرنے پر راضی نہ کر سکا۔ اس نے اپنی کمزوری کو زیر کرنا اور چکر دیے رکھنا جاری رکھا حتیٰ کہ مدرسہ کی انتظامیہ نے اسے آخر کار قبل از وقت ریٹائر کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

"بعد ازاں اس کے تحقیقی مقالے کی مطالعاتی کمیٹی کا آخری فیصلہ آگیا: یہ بات واضح ہونے کے بعد کہ ایک نابینا شخص پانچ سو سے زائد صفحات درست زبان میں باریک بینی سے تحریر اور پیش نہیں کر سکتا کمیٹی نے متفقہ طور پر فارس موصوف کا تحقیقی مقالہ مسترد کر دیا ہے جس کا عنوان (تربیت و تعلیم کے مناہج پر مبنی اصلاح) ہے"

جیسے تاریخ خود کو دہراتی ہے۔

حلیمہ کو بھی وہ سب درپیش آنے لگا جس کا شکوہ فارس کیا کرتا تھا۔ اسے منتظم سے پہلی تحریری وارننگ ملی۔ اور صرف اس وجہ سے کہ اس نے فکری سرگرمیوں کے لیے کچھ کلاسز متعین کرنے کی تجویز دی تھی۔ منتظم نے اس پر جارحانہ انداز میں نظامِ تدریس کو غیر مستحکم کرنے کا الزام لگایا۔

اسے یہ موقع بھی نہیں دیا کہ وہ منتظم کے سامنے طلباء کی سمجھ بوجھ اور ان کے مستقبل کے ارادوں کی بہتری کے لیے فکری مقابلوں کی اہمیت واضح کر سکے۔ منتظم نے مبالغہ آرائی کی حد تک اس کا مذاق اڑایا اور اس کے خلاف تادیبی کاروائی کرنے کی دھمکی دے دی۔

الفاظ جیسے اس کی زبان پر جم گئے اور آنسو اس کی آنکھوں میں امڈ آئے۔ اس کے سامنے فارس کا چہرہ گھوم گیا جب وہ ٹوٹے دل کے ساتھ اور پریشان حال مدرسہ سے روانہ ہو رہا تھا۔

وہ مشکل سے اپنا راستہ تلاش کر پا رہا تھا۔ اس نے ایک سے زائد مرتبہ مدرسہ کے صحن میں چکر لگایا اور خارجی دروازے کی طرف راستہ پالینے سے قبل متعدد اشیاء سے ٹکرایا۔

وہاں موجود لوگوں میں سے کسی نے بھی اس کی مدد کرنے یا کم از کم اچھے الفاظ میں الوداع کرنے کی تکلیف نہیں کی۔ اپنے درس کی واضح، مدلل اور لمبی تشریح کے سوا اسے کوئی اور شے نہ ملی کہ جس پر وہ اکتفا کرتا اور اپنے قدموں کی سمت کا تعین کر پاتا۔

اس کی کہانی سارے درس کے دوران حلیمہ کے دماغ میں گھومتی رہی۔ اس کے بعد وہ اچاٹ دل کے ساتھ اساتذہ کے کمرے میں گئی۔ وہ گفتگو سے گریزاں تھی مگر باتوں کی چلتی چکی اس کے خیالات پر مسلسل قابض رہی۔

درس کے معاملات، طلباء کی نافرمانی، ان کے والدین کی غلط فہمی اور اساتذہ کے لیے محرکات و سہولیات کی کمی پر ہونے والے معمول کے شور نے اسے اکسایا اور اس کی زبان حسب عادت ہمدردی سے پھسل گئی: "صرف سوچ کی روشنی ہی راستوں کی تاریکی کو ختم کرتی ہے"۔

!گویا اس نے غصہ دلانے والی گیس ان کے درمیان پھینک دی

اس سے پہلے کہ وہ کرسی سے اٹھتی اس پر یلغار ہو چکی تھی۔ ایک استاد کی ہاتھی جیسی چنگھاڑتی آواز جیسے پھٹ پڑی:

"یہ خود کو تبدیلی کی علامت سمجھتی ہے"۔

دوسرے نے اس کی تائید کی:

"تاریخ کی ایک استانی سے حنوط شدہ نعروں اور بوسیدہ تقریروں کے سوا آپ اور کیا توقع کر سکتے ہیں؟! اس کے لیکچر دراصل قصے کہانیاں ہیں، محض تفریح"۔

ایک اور نے گونج دار قہقہہ لگایا اور کہا:

"سب سے مضحکہ خیز بات یہ ہے کہ وہ ڈیپارٹمنٹ میں دھوپ کے چشمے پہنتی ہے تاکہ عمر میں چھوٹی لگ سکے اور کسی بھی طریقے سے طلباء کی محبت حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہے"۔

"اساتذہ کے کمرے کا دروازہ گویا اس کے لیے ہنگامی دروازہ بن گیا اور قبل اس کے کہ دوسرے اساتذہ کے تبصرے اس پر موسلا دھار بارش بن کر برستے اور اسے دوبارہ سننا پڑتا کہ وہ پیچیدہ اور حاسد ہے وہ جلدی سے دروازے کی طرف لپکی، اساتذہ کے بقول اس کا مضمون خصوصی تعلیم و تدریس کے لیے غیر موزوں تھا اور وہ اپنی متشدد سوچ کے باعث شادی سے قبل ہی راکھ کا ڈھیر بن جانے والی تھی اور دراصل یہ اسی سوچ فارس کے تہہ خانے میں نشوونما پائی تھی"!

وہ گھبراہٹ میں ان میں سے ایک استاد سے ٹکرا گئی جس سے اس کا دھوپ والا چشمہ گر گیا۔ اس استاد نے حلیمہ کی سوجھی ہوئی آنکھوں پر نظریں گاڑ دیں جن کے گرد ایک گہرے بنفشی رنگ کا حلقہ پڑا ہوا تھا اور جس میں سبز و زرد رنگ کے دھبے ملے ہوئے تھے۔ وہ بلند آواز سے بولا:

"!تمھارے ساتھ یہ کس نے کیا؟"

اس کی اس بات نے دوسروں کو بھی متوجہ کر لیا اور وہ حلیمہ کو دیکھنے لگے۔ وہ اس سے پوچھنے لگے کیا ہوا جبکہ وہ ان کے تبصروں اور ان کی جانب سے ظاہر کی جانے والی ہمدردی کی پروا کیے بغیر زمین پر بکھری اپنی اشیاء اٹھاتی رہی اور آخرِ کار اس نے اپنا سر اٹھایا اور لاپروائی سے بولی:

"میں نے ایک طالب علم سے کہا کہ وہ نقشے پر آثار قدیمہ کی نشاندہی کرے تو اس نے میرے چہرے پر صفائی کرنے والا کپڑا پھینک دیا جس نے آثارِ جدیدہ نمودار کر دیے"۔

مذمت اور ناپسندیدگی کی آوازیں بلند ہونے لگیں:

"!اس نے تمھیں مارا؟"

"نہیں۔ اس نے منظر نامہ مکمل کیا ہے"۔

اس نے چند قدم اساتذہ کے کمرے سے باہر جانے کے لیے اٹھائے پھر ان کی جانب مڑی اور بولی:

"!جب مجھے استاد محض ایک قصہ گو کے طور پر دیکھے گا تو اس میں کوئی اچنبھے کی بات نہیں کہ طالب علم بھی کسی مختلف منظر نامہ کے بارے میں سوچے گا"

الٹا توقف

شام اذیت ناک آنسوؤں کے ساتھ ڈھل گئی۔
جیسے وہ کسی آتش فشاں کے اندر چھپی بیٹھی تھی!
اور اندر سے انگاروں کا ساتھ دہک رہی تھی۔

ہم تیزی سے ایئر پورٹ کی جانب بڑھے۔ ہماری خواہشات اور ہماری پشیمانیوں ایک ساتھ دوڑ لگائے ہوئے تھیں۔ ابھی بھی ہمارے پاس فلائٹ کی روانگی سے قبل وقت تھا لیکن ہمارے ذہن اور دل ہم سے پہلے ہماری منزل پر پہنچ چکے تھے۔

وہاں قریبی شہر کے کسی ہسپتال میں ایک انسان زندگی اور موت کے درمیان جھول رہا تھا۔ وہ منتظر تھا کہ اس کے لیے فوراً ایک دل کی پیوند کاری کی جائے۔

آپریشن دقت طلب اور منفرد تھا۔ بطور ایک طبی ٹیم کے ہمارے لیے پہلا تجربہ تھا کہ کسی بچے کا دل کی ایک بالغ شخص کے جسم میں پیوند کاری کریں۔ ہم نے مکمل خاموشی سے سفر کا ایک حصہ طے کر لیا۔ گاڑی متحرک مجسموں کے ایک عجائب گھر میں تبدیل ہو چکی تھی!

میں نے اپنی نظریں کھڑکی سے باہر ان چیزوں کا جائزہ لینے کے لیے دوڑائیں جو پیچھے کی طرف پسپا ہو رہی تھیں جبکہ میرے دماغ میں وہمات آتے جا رہے تھے۔

خیالات مجھے دور تلک آپریشن کے مابعد تک لے گئے۔ میرے ذہن میں حیاتِ انسانی سے متعلق تصورات اس کی تمام تر تکلیف دہ تفاصیل کے ہمراہ گھوم گئے کہ کیسے بچپن کی دھڑکنوں کے ساتھ زندگی اس میں بالغ عمر کے تجربات بھر دیتی ہے۔

"کیا ہم کامیاب ہوں گے؟"

طبی ٹیم کے ایک رکن کی آواز مجھے زمانہ حاضر میں واپس لے آئی۔ وہ بولا: زندگی کا بچانا سب سے اہم ہے۔

شعور کے ایک خاص مرحلے پر زندگی کھو جانے کے ڈر سے زمانے کا احساس فنا ہو جاتا ہے اور بہت سی تفاصیل گم ہو جاتی ہیں۔

زندگی! وہ چیز ہے جس کے ہم مالک نہیں ہیں اور ہم اس کی خاطر آپس میں الجھتے رہتے ہیں۔

ہمیں ادراک ہے کہ زندگی ایک زمانی و مکانی مظہر ہے لیکن اس کے باوجود یہ ہمیں ابدیت کی مانند اکسالیتی ہے۔

آخر کار وجود ایک امانت کے سوا کچھ نہیں جو محض ہواؤں میں ہماری بخارات زدہ سانسوں کا عہد ہے۔

اور بطور طبیب ہم اس کو محفوظ رکھنے کی کوشش کے سوا کچھ کرنے پر قادر نہیں ہیں۔

میرے خیال میں یہ سوچ ہی ہے جو سینوں کو دھڑکاتی ہے۔ ہر شے کا حساب وقت کے ٹکڑوں میں ہو رہا تھا۔ ایک لمحے کی تاخیر کی وجہ سے ہمیں ایک انسانی جان کھونا پڑ سکتی تھی۔ وہ ایک عہد کی تھکاوٹ تھی جو ہمیں امید تھی کہ تیس سال سے طویل ہو جائے گی۔

ہم گاڑی سے ایسے اترے ہوئے چہروں کے ساتھ باہر آئے جن پر امید اور خوف کے گہرے تاثرات آجا رہے تھے۔

ہم جلدی سے تیز حرکات اور مضطرب تاثرات کے ساتھ انتظار گاہ کی جانب لپکے جیسے آسمان پتھروں کی بارش کر رہا تھا۔ اچانک ہمارے قدم آہستہ ہو گئے اور ہماری آنکھیں ایک ایسے مقام پر جم گئیں جہاں ایک بڑا انسانی مجمع لگا تھا جس سے لگ رہا تھا کہ کوئی خاص واقعہ ہوا ہے۔

وہاں مرد اور عورتیں ایک ہی جگہ پر ہجوم لگائے ہوئے تھے۔ نعرے، خوش آمدید کے پوسٹر بلند ہو رہے تھے۔ پروفیسر رحمہ کی نظریں تجسس سے لبریز ہو چکی تھیں اور پھر اس نے نتیجہ اخذ کرتے ہوئے کہا:

"!شادی کی بارات"

اس نے اپنا جملہ مکمل کیا ہی تھا کہ ایک جوان عورت نمودار ہوئی جو تفاخر سے آگے بڑھی اور دائیں بائیں مسکراہٹیں بکھیرنے اور خوش آمدید کے اشارے کرنے لگی۔ قوی ہیکل پہرے داروں کی ایک باڑ جس نے اس کے اور ہر طرف سے اس کا نام پکارنے والوں کے مابین ایک فاصلہ رکھا ہوا تھا وہ فوٹو گرافی کے کچھ کیمروں کی جانب متوجہ ہوئی اور کچھ کی طرف اپنی پشت کر لی۔

"جوجو.. ادھر دیکھو!"، "تھوڑا سا گھوم جاؤ اے فنکارہ!"، "ایک اور مسکراہٹ"... "جوجووو..!" "آپ زندگی میں مثالی ہیں!"، "میں آپ کو پسند کرتا ہوں"!

اس کا نام پکارنے والوں کا ایک گروہ اس کے پیچھے اس مہنگی گاڑی تک چلتا رہا جو اس کا انتظار کر رہی تھی۔ کھڑکی کا سیاہ شیشہ اوپر ہونے سے پہلے اس نے ان کے لیے ایک بوسہ ہوا میں چھوڑا اور ان کی آنکھوں کو اسے جی بھر کر دیکھنے اور اس کے ساتھ ایک تصویر لینے کی شدید خواہشات سے امڈتا چھوڑ کر چلی گئی۔

ہم نے آپس میں متجسس نظروں کا تبادلہ کیا: کون ہو سکتی ہے؟ یقیناً اس کے کارنامے عظیم ہوں گے جس کی وجہ سے اسیعوام اور انتظامیہ کی جانب سے ایسا پرجوش استقبال مل رہا ہے"!"

گاڑی کا ڈرائیور عامر جو ہمارے ساتھ تھا اس نے یوں ایک زوردار قہقہہ لگایا گویا کہ اسے ہوا کے جھونکوں نے چھیڑ دیا ہو اور بولا:

"فلمسٹار (ہر مسز) واپس آ گئی ہے"۔

رحمہ کے چہرے پر تجسس اور شک کے ملے جلے آثار امڈ آئے اور صاف لگ رہا تھا کہ وہ کسی اہم مقابلہ سے اپنا بے خبر ہونا غلط محسوس کر رہی ہے۔ اس نے شرمندگی سے بھرپور لہجے میں کہا:

"!ہر مسز؟! تحقیق و تالیف نے مجھے حقیقی دنیا سے ایک نوری سال دور کر دیا ہے"

ڈرائیور نے فوراً اس کے لیے وضاحت کی:

"جو جونے بہترین پلکیں ہلانے والے "کا ایوارڈ جیتا ہے جو ایک علاقائی مقابلہ ہے جس میں درجنوں باصلاحیت نوجوان شرکت کرتے ہیں"۔

رحمہ کی آنکھیں تفصیلات جاننے کی خواہش سے بھر گئیں۔

اس سے قبل کہ وہ مزید سوالات کرتی میں نے چپکے سے اسے تھپکی دی۔ مجھے ادراک تھا کہ وہ ہسپتالوں اور سائنسی تجربہ گاہوں کے علاوہ شاید زیادہ نہیں جانتی بلکہ مجھے کبھی کبھی لگتا تھا کہ ان سے باہر کی دنیا کو وہ زندگی کا ضیاع تصور کرتی ہے۔

وہ اپنے تمام تعلیمی مراحل میں ممتاز رہی تھی اور دل کی پیوند کاری کی سب سے ماہر سرجن بن چکی تھی۔ اس نے کئی لوگوں کی زندگی بچائی جن میں سے بیشتر کی حالت نازک تھی۔

مجھے رحمہ کے ردعمل کے بارے میں مضحکہ خیز خیالات نے گھیر لیا مثلاً جب اسے آشکار ہوگا کہ ڈرائیور کی مراد وہ نہیں ہے جو اس کے دماغ میں ایک عظیم انسانی اختراع کا تصوّر چل رہا ہے۔ میں نے بمشکل ہنسی کے دورے کو قابو کیا جو نادانستہ طور پر مجھے پڑ چکا تھا اور اسے سرگوشی کی:

"آنکھوں کی پلکوں کو ہلانے کا مقابلہ جس کے شرکاء پلکوں کو طویل ترین مدت تک سب سے زیادہ حرکت دینے کا مقابلہ کرتے ہیں"۔

اس کے چہرے کے تاثرات حیرت، ناراضگی اور گفتگو جاری رکھنے کی رغبت کے تضاد کا مظہر بن گئے۔ یوں لگا جیسے وہ ہماری دنیا سے ہی غائب ہے۔ اس نے اپنی نظریں وہاں گاڑ دیں جہاں سے (جوجو) روانہ ہوئی تھی۔

مجھے ایک لمحے کے لیے لگا کہ وہ اسے ایک آپریشن تھیٹر کے طور پر دیکھ رہی ہے۔ عموماً وہ مریض کے بستر کے سوا کسی اور کو ان نظروں سے نہیں دیکھتی تھی خصوصاً جب وہ اس کا آپریشن کرنے کی تیاری کر رہی ہوتی تھی۔

میں نے رحمہ کو اپنے خیالات میں گم چھوڑا اور طبی ٹیم کے دو مزید ارکان، اینستھیزولوجسٹ احمد اور مستند سرجن وفیق کا استقبال کرنے میں مشغول ہو گیا۔ میں نے مذاق سے ان دونوں کو کہا:

"ہماری واحد بے وفا عوام! مجھے لگتا ہے جیسے میں نے تم دونوں کو اس مجمع میں سے تب اچک لیا ہے جب تم دونوں تالاب کی مچھلیوں کی مانند (جوجو) کے قافلہ کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے ایک دوسرے پر اچھل رہے تھے"!

وفیق جوش سے بولا:

"!یہ ایک مکمل طور پر پیشہ ورانہ کارمنصبی تھا"

میں نے طنز سے اسے کہا:

"!ایسا کون سا کارمنصبی ہے جو گمنام زمانہ دل کے سرجن اور عالمی شہرت یافتہ (جوجو) کو اکٹھا کر دیتا ہے؟"

اس نے مزید مزاحیہ انداز میں کہا:

"!جیم کا حرف"

اس کے بعد اس نے رحمہ کے بیگ کی جانب دیکھا اور اسے کہا:

"!تمہارے بیگ کے مطابق تو تم برفانی دور معدومیت سے تعلق رکھتی ہو! کیا تم نے (جو جو) کا سامان دیکھا ہے! رنگ، ملبوسات کے برانڈ اور عطر! ان دونوں میں بہت فرق ہے"

رحمہ کی رنگت سیاہ پڑ گئی۔ اس پر ناراضی کے آثار ابھر آئے اور قبل اس کے کہ وفیق اپنے مذاق میں بہت آگے نکل جاتا میں نے جلدی سے دونوں کا باہمی تعارف کروایا:

"!پروفیسر رحمہ رائد"

وفیق نے سنجیدہ چہرہ بنا لیا اور اپنی نظریں رحمہ کے بیگ پر گاڑ دیں۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ رحمہ کے پاس بھی وہی دلِ منتظر اور زندگی ہے۔

ایک مرعوب کن خاموشی چھا گئی اور اچانک ہم سب کی نظریں رحمہ کے بڑے بیگ پر مرکوز ہو گئیں۔

ہم نے آپریشن تھیٹر میں دس سے زائد گھنٹے گزارے۔ اس دوران ایک سے زائد مرتبہ ہماری سانسیں جیسے رک گئیں۔ لگتا تھا کہ ہمارے دل ہمارے سینوں سے نکل جائیں گے۔ ہمارے چہروں کے مضطرب تاثرات نے آپریشن کامیاب ہونے کے بعد ہی سکون کا سانس لیا۔

یہ خبر اخبارات کے پہلے صفحات اور ٹی وی سکرینوں کی شہ سرخی بن گئی۔ ہمیں اس شہر میں مختلف اداروں سے متعدد اعزازات ملے اور ہم پر نوکری کے مواقع اور دلکش منصوبوں کی جیسے بارش کر دی گئی مگر ہم نے اپنے شہر لوٹنے کو ترجیح دی۔ ہم وقت کو لمحوں کے حساب سے گن رہے تھے تاکہ ہم کامیابی کی خوشی کو اپنے اہل وعیال کے ساتھ بانٹ سکیں۔

ہم اہل خانہ سے ملنے کی بے تابی کے ساتھ طیارے سے اترے۔ ہم نے کچھ لمحے دائیں بائیں دیکھتے گزارے لیکن ہماری واپسی کی فضا ہماری روانگی کی فضا سے مختلف نہ تھی۔ ڈرائیور

کے علاوہ کوئی ہمارے استقبال کے لیے نہیں تھا اور اس نے بھی بد دلی سے اپنی آواز بلند کی:

"ہاہاہا- ہم یقیناً رات یہاں گزاریں گے! یہ میری چھٹی کا دن ہے۔ اگر آپ کو خوش قسمتی سے اپنی واپسی کا دن یاد ہو تو مجھے رضاکارانہ طور پر آپ کو لے کر جانا ہے"۔

ہمیں ایک وحشت ناک، دل گیر احساس نے آن گھیرا جو اجنبیت، تنہائی اور بے بسی سے مرکب تھا۔ ہم اس بات کے متمنی نہیں تھے کہ ہمارے استقبال کے لیے خود کو فنا کر دینے کی حد تک تعریف و توصیف میں غرق (جوجو) والی عوام ہو گی اور نہ ہمیں مبالغہ آمیز کلمات سننا تھے اور نہ ہمیں چمکی دمکتی روشنیوں میں رنگ جانے کی خواہش تھی۔

لیکن ہمیں امید تھی کہ کچھ لوگ ہمارے ساتھ یہ لمحہ بانٹیں گے۔ وہ لمحہ جب انسان کا درد دوسرے انسان کے پسینے میں گویا غرق ہو جاتا ہے۔

کیا اس جشن کا حق نہیں پہنچتا۔ انسان کا جشن!

"میں اس سے قبل رحمہ سے بطور طبیب متاثر تھا لیکن میں اس کے ساتھ رہنے پر مائل نہیں تھا۔ اس کی حد سے زیادہ سنجیدگی سے مجھے لگتا تھا کہ جیسے وہ ابھی ابھی مجسموں کے عجائب گھر سے فرار ہو کر آئی ہے مگر اس لمحے سے مجھے اس بات کا مفہوم سمجھ آ گیا کہ مختلف ہونا بھی ایک رحمت ہے اور میں نے حسرت سے خود سے کہا: "کیا ہم رحمہ کے چلے جانے سے کم مایہ نہیں ہو جائیں گے؟"

میرا اپنی زندگی میں اس کے وجود کے بارے نقطہ نظر تبدیل ہو گیا۔ میں اس کی رفاقت میں خود کو اپنے روزمرہ کے معمول سے ہٹ کر ایک آزاد سفر پر تصور کرنے لگا تھا۔

زندگی واقعی کوئی مجسموں کا عجائب گھر نہیں ہے۔ اس لیے یہ انصاف نہیں کہ ہم اپنے اندر مجسموں کی ایک ورکشاپ بنالیں جس میں ہماری انا پرستی دوسروں کے وجود تراشتی رہے۔

صرف اسی بنا پر میں نے دوسروں کے ساتھ بوجھل اور مایوسی کے بوجھ تلے دبے ہوئے قدم اٹھائے تھے کیونکہ ہمیں نہیں اندازہ تھا کہ ہم کہاں ہیں اور نہ پرواتھی کہ آئندہ کیا ہوگا۔

ہم گاڑی سے چند میٹر دور رک گئے۔ ہماری توجہ ایک بڑے مجمع، مترنم اشعار، نعروں، پہرے داروں، مائیکروفونوں، کیمروں اور ہر سمت سے بلند ہوتی آوازوں نے اپنی طرف مبذول کرلی۔

وفیق اور احمد نے شرارتی مسکراہٹوں کا تبادلہ کیا اور یکدم بولے:

"!(جوجو)! ایک دلچسپ اتفاق"

ڈرائیور نے ایسا قہقہہ لگایا کہ اس کے لعاب کی پھوار ہوا میں بکھر گئی اور بولا:

"!ناممکن ہے! (جوجو) اب دور جا چکی ہے! اسے 'فکری ترقی کا سفیر' منتخب کرلیا گیا ہے۔ یہ (کمامبو) ہے، کیا آپ نے اس کے بارے میں نہیں سنا ہوا؟"

اس نے حیرت زدہ نظروں سے "حیرانی سے" حواس باختگی سے بے بس ہمارے چہروں پر نظر دوڑائی اور ایسے صحافی کی طرح جو کوئی نئی خبر دیتا ہے مزید بولا:

)"! کمبامبو) نے یوٹیوب پر ایک ویڈیو میں جلوہ افروز ہونے پر دو ملین (likes) حاصل کیے ہیں۔ اس نے جو کیا وہ غیر معمولی ہے! مجھے نہیں پتا کہ اس نے یہ مقام کیسے حاصل کرلیا"

رحمہ کے چہرے پر خوشی جھلک اٹھی اور اس نے کہا:

"اس نے دماغ کا مقام تبدیل کر دیا ہوگا؟"

عامر زور سے ہنسا اور بولا:

"نہیں، دماغ کا دل"

وہ ناراضی سے بولی:

"میں مذاق نہیں کر رہی"۔

اس نے بھی اسی سنجیدگی سے جواب دیا:

"اور میں بھی نہیں کر رہا۔ (کمامبو) نے اپنی دونوں ٹانگوں کے درمیان میں اپنا سر ایک منفرد پہلوانی انداز میں رکھا اور جوس کی پوری بوتل پی گیا پھر بولا: "زندگی کا مزا تو الٹ میں ہے"! واقعی تب سے اس کی زندگی کی سمت بدل گئی۔ اس نے بہت دولت جمع کر لی ہے، اس کی شہرت پھیل گئی ہے اور اسے کئی مقامی و بین الاقوامی محفلوں میں ہماری نمائندگی کرنے کی پیشکیں ملنے لگی ہیں۔ اس سے پہلے وہ ایک گمنام و مفلس نوجوان تھا"۔

ہم سب نے نظروں کا تبادلہ کیا اور وہ ایک مرتبہ پھر رحمہ کے بیگ پر مرکوز ہو گئیں جس میں وہ اپنی سائنسی اسناد اٹھائے پھرتی تھی۔ سب سے پہلی بات جو میرے ذہن میں آئی، وہ ایک مجسمہ تھا جو شہر کے میئر نے ہماری کوششوں کی تکریم میں ہمیں دیا تھا۔

مجھے لگا کہ وہ چیخ رہا ہے، ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا ہے اور چیخ کر کہہ رہا تھا: "کیا تم مجھے اس لیے یہاں لائے ہو کہ اپنی زندگی کے عجیب و غریب اتار چڑھاؤ سے مجھے دھمکا سکو؟!"

احمد نے مایوسی میں ڈوبے لہجے میں کہا:

!"واہ پھر کیا ہوتا اگر وہ (مقلوبہ) پکوان الٹا چٹ کر جاتا! پھر تو پورا مشرق اس کی عزت و تکریم کرنے لگتا؟"

میں نے ان کو بات چیت میں مگن چھوڑا اور میرا تخیل مقلوبہ نامی معروف پکوان کے خیال میں ڈوب گیا کہ کیسے اس کو تیار اور الٹا سیدھا کیا جاتا

ہے... اس کے نیچے سبزیاں اور گوشت کے ٹکڑے ہوتے ہیں جن کو چاولوں نے ڈھانپا ہوتا ہے پھر یکدم برتن کو الٹا یا جاتا ہے اور وہ پکوان کے اوپر آجاتے ہیں۔

کیا ہم انسانوں کے معاملات اتنی آسانی سے بدل جاتے ہیں جیسے (مقلوبہ) کی حالت تبدیل ہو جاتی ہے؟ محض مقلوبہ کے پکوان کو الٹنا!

یہ سوال میرے ذہن میں "الٹ زندگی" کے تصورات لے آیا... میرے سامنے طلباء کا منظر آگیا جب وہ الٹے بیٹھے ہوں اور کتابوں کو الٹا کر پڑھ رہے ہوں... اور وہ الٹی لکھائی... اور ہر شے الٹ۔

میں نے قطب شمالی کی جگہ تاریک قطب جنوبی کو دیکھا اور دل نے سینوں میں اپنی جگہ تبدیل کر لی اور اس کا پہلو اوپر کی طرف آگیا۔ مجھے اپنے سر کے بارے میں شک ہونے لگا اور میں نے سوال کر دیا:

کیا وہ صحیح جگہ پر ہے؟ کیا الٹ تو نہیں گیا؟""

میں نے غیر دانستہ طور پر بلند آواز میں کہا:

"!ذرا تصور کرو کہ اگر کمامبو (مقلوبہ) کو ایک معکوس ریستوران میں کھا رہا ہو"

میرے ارد گرد ہنسی پھیل گئی۔ مایوسی کی فضا چھٹ گئی اور میرے رفقاء کی گفتگو اس آپریشن اور اس کے احوال کی جانب لوٹ آئی۔

مگر میں اب بھی ان الٹ تصورات کی تفصیلات کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ میں نے کوشش کی کہ ان تصورات اور رحمہ کے بیگ کے مابین مماثلت کے پہلو تلاش کروں۔ مجھے ڈر تھا کہ جن سائنسی رپورٹس کے ساتھ وہ واپس آئی ہے شاید وہ اس کے اندر یہاں تک الٹ گئی ہوں گی کہ ہمارا ان کے مضمون کو پڑھنا تبدیل ہو جائے گا۔

مجھے احساس ہوئے بغیر میری آواز پھر ایک دفعہ بلند ہو گئی:

"!الٹ زمانہ"

افسردگی آشکار کرنے والا آلہ

مہمانوں کی روانگی کے بعد خاموشی چھا گئی اور میرے دماغ میں جیسے خواہشات کی ہل چل مچ گئی۔

انہوں نے میرا دروازہ ایک ایسی سرد اور تاریک رات میں کھٹکھٹایا تھا جس میں ڈراؤنے خواب سانسوں پر قابض ہو جاتے ہیں اور انہوں نے ایک آواز یمیرے اندر پرانے خوابوں کی تمازت بھیر دی تھی:

"ہم 'انجمن حمایت افسردگان' کے نمائندے ہیں۔ ہمارے انسانی حقوق کے کارخانوں نے ایک ایسا آلہ ایجاد کیا ہیجو قبیلہ میں افسردگی کے واقعات پر نظر رکھتا ہے اور ہمیں آپ کی ضرورت ہے"

مجھے لگا وہ غلط جگہ پر آ گئے ہیں۔ میں نے انہیں متنبہ کرتے ہوئے کہا:

"میں بے آبروئی کے خلاف کام کرتا ہوں اور میرے پاس افسردگی کی روک تھام کا کوئی تجربہ نہیں ہے"۔

ان میں سے ایک طنزیہ انداز میں ہنسا اور بولا:

"جن کو آپ تنگ نظری، الفاظ کی تاریکی اور فطرت سے غفلت کا نام دیتے ہیں کیا وہ مخلوقات کے حقوق کی بے آبروئی نہیں ہے؟"

اس کی گفتگو میری کھوپڑی پر اوس کی طرح گری۔ مجھے شرمندگی سی ہونے لگی۔

میں نے کوشش کی کہ موقف کو سمجھوں۔ میں اس سے قدرے احتیاط سے بولا:

"اتنے اہم منصوبہ کو قبیلہ کی حدود سے ماوراء ہونا چاہئے"۔

اس مرتبہ وہ آدھا مسکرایا گویا کہ وہ بتدریج اپنے چہرے کیتاثرات کو آزاد کرنے کا ارادہ رکھتا تھا اور بولا:

"آپ کے دماغ میں جو قبیلہ اٹکا ہے اس کا خیمہ معمولی ذاتی مفادات کے درمیان بٹ چکا ہے اور نیا قبیلہ اس کے ٹکڑوں کو مشترکہ انسانی مفادات کی خاطر یکجا کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ دراصل اس وجہ سے ہی ہم اس وقت کرۂ ارض کے دوسرے کنارے سے آپ کے پاس آئے ہیں"۔

میں نے حیرت سے جواب دیا:

"مشترکہ انسانی مفادات"

اس نے سنجیدہ انداز میں اضافہ کیا:

"آپ کو بطور سفیرِ شفافیت منتخب کیا گیا ہے"۔

اس کی نگاہیں میری آنکھوں پر مرکوز ہو گئیں پھر اس نے اپنے پرس میں سے ایک تصویر نکالی اور بولا:

"یہ آشکار کرنے والا آلہ ہے جس کا استعمال ہمارے قبیلے کی تاریخ میں پہلی دفعہ کیا جائے گا اور آپ اس تجربہ میں شرکت کریں گے"۔

میں نے پراگندہ خیال نظروں سے آلہ کی تصویر کو بغور دیکھا اور حیرانی سے بڑبڑایا:

"آشکار کرنے والا آلہ"

اس کے سینے میں قید دھواں جیسے ایک دم بلند ہوا اور وہ بولا:

"یہ افردگی آشکار کرنے والا آلہ ہے۔ جیسے ہی اسے چلایا جاتا ہے یہ حاس لہریں چھوڑتا ہے جو دماغوں میں داخل ہو جاتی ہیں اور اس کی سکرین پر اس مقام پر موجود لوگوں کے احوال کا خلاصہ آجاتا ہے۔ اس کے بعد ایک اور بٹن کو دبایا جاتا ہے تو یہ آلہ اس افردگی کے ذمے دار شخص کی جانب سگنل بھیجتا ہے۔ اس کی زبان کے عضلات کمزور پڑ جاتے ہیں، زبان اس کے منہ سے نکل آتی اور لٹکنا اور طویل ہونا شروع کر دیتی ہے حتیٰ کہ وہ اس کے سامنے پھیل جاتی ہے اور جو کچھ اس شخص کے اندر ہو رہا ہوتا ہے اسے ہو بہو بیان کر دیتی ہے۔ زبان اپنی عام حالت پر تب

تک واپس نہیں جاتی جب تک اس آلہ کا پرنٹر اس کی ایک کاپی نہیں بنا لیتا جس پر اس کے اعتراف کی مہر لگی ہوتی ہے"۔

مجھے ظلم کا مقابلہ سچائی کینفاذ سے کرنے والی سوچ پر تعجب ہوا۔ میں نے اپنا ہاتھ اس کی طرف مصافحہ کے لئے بڑھایا اور پر جوش انداز میں اس سے کہا:

"... آپ کا آنا میرے لئے قابل فخر ہے جناب"

اس نے زور سے میرا ہاتھ دبایا پھر ایک مکمل مبہم مسکراہٹ دی اور چلا گیا۔

جیسے ہی اس نے مجھ سے دور کچھ قدم اٹھائے تو میں نے اپنا جملہ مکمل کرتے ہوئے کہا:"مونس"!

جب کچھ عرصہ اس کی کوئی خبر نہ آئی تو مجھے پریشانی ہوئی۔ میں اس عجیب و منفرد تجربہ کے لیے بے تاب تھا۔ پھر کچھ ماہ بعد قحط کے زمانے میں موسلا دھار بارش کی مانند اس نے رابطہ کیا اور میں جلد ہی اس حوالے سے کام کرنے والی ایک ٹیم کے ساتھ منسلک ہو گیا۔

ہم خوشی سے ایک محلے سے دوسرے محلے جاتے تھے۔

ہمارے پاس آلودہ، طویل اور چھوٹی زبانیں آنے لگیں جبکہ مختلف معمول کے جملے آلہ کی سکرین پر نمودار ہونے لگے:

"برائیوں کی اچھائیوں سے بٹائی"، "گوبر کی کاشت کاری"، "اسرار کو مسخ کرنے والیکانسخہ"، "ضمیروں کی سٹاک ایکسچینج کو بین الاقوامی کرنا"

خفیہ علامات اور اشارے آلے کی سکرین پر یکے بعد دیگرے ظاہر ہوتے گئے اور جن زبانوں سے آلہ گزر رہا تھا وہ مستنوع ہوتی گئیں۔

وہ رپورٹس جو میں نے تیار کیں میں ان کو اتنے اہتمام سے پکڑتا تھا جیسے میں نے شیطان کا سر پکڑ لیا ہو تا کہ میں ان کو انجمن کے سربراہ کے سامنے رکھ سکوں اور

شاید یہ کام افسردگی کا مقابلہ کرنے اور افسردگان کو انصاف دلانے میں مددگار ہو سکے۔

ہمیں تھکاوٹ اور تکلیف تو ہوئی مگر اس کے باوجود ہم نے اپنا سفر دوسرے محلوں اور گھروں کی جانب جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔

ہم اجتماع گاہ سے تھوڑی ہی دور گئے تھے کہ باقی محلوں سے الگ تھلگ جنگل کی ایک بڑی پہاڑی کے عقب میں ایک محلہ نظر آیا جو پہاڑی کی وجہ سے آنکھوں سے تقریباً اوجھل تھا۔

اس کا ذکر ہمارے پروگرام میں نہیں تھا اور بظاہر ٹیم کے باقی افراد کے پاس بھی اس کے بارے میں کوئی معلومات نہیں تھی۔

ہم اس محلہ کے داخلی راستے پر گھٹنوں کے بل بیٹھ گئے اور افسردگی آشکار کرنے والے آلے کو چلادیا۔ سکرین نے کوئی نتیجہ درج نہ کیا۔ ہم نے ایک مرتبہ، دو مرتبہ اور اس سے زیادہ مرتبہ تجربہ کیا لیکن اس میں سے سوائے متفرق اشاروں اور پریشان کن آوازوں کے کچھ نہ نکلا۔

ہم تجربے پر تجربہ کرتے گئے حتیٰ کہ تاریکی نے ہمیں آن گھیرا۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ ہم اپنی رات اسی جگہ گزاریں گے اور دور سے اس مقام کا جائزہ لیں گے۔

کچھ گھنٹوں کے مشاہدے کے بعد پہاڑی کے عقب میں ایک شے کی تصویر ہمیں نظر آئی۔ وہ معمول جیسی زبان نہیں تھی۔ ایک لمبے سائے والا شخص ہمارے پاس آیا جس پر ایک سیاہ چھتری نے سایہ کیا ہوا تھا جو ہماری لائٹس کی روشنی کو اس تک پہنچنے سے روک رہی تھی۔

ہمارے اور اس کے درمیان چند میٹر کا فاصلہ رہ گیا۔ اس نے پائپ تمباکو کو ماچس کی تیلی سے سلگایا تو مجھے محسوس ہوا کہ میں اسے جانتا ہوں اور جیسے ہی وہ بولا تو میرا یقین چیخ اٹھا:

"!مونس"

اس نے اپنے سلگتے ہوئے تمباکو پائپ سے پہاڑی کی جانب اشارہ کیا اور تحکمانہ انداز میں بولا:

"!وہاں افسردگی کا گڑھ ہے۔ یہ اس کے سایوں میں سے ایک سایہ ہے جو محلوں میں سے کسی محلے کی جانب فرار ہونا چاہتا ہے! اس کا ادراک کرو"

میں حواس باختہ ہو کر بھاگنے والوں کے ساتھ بھاگ اٹھا۔ یہی بھاگنے کا مناسب موقع تھا۔ میں دوڑتا رہا، دوڑتا رہا حتیٰ کہ ایک پہاڑی علاقے میں پہنچ گیا۔ میں ایک غار میں داخل ہوا اور اس بات سے ڈرتے ہوئے وہاں پناہ لے لی کہ کہیں مونس کے مختلف سمتوں میں پھیلے لوگ مجھ تک نہ پہنچ جائیں۔ مجھے نہیں پتا کہ جب میں اپنے خوف کے بارے میں سوچ رہا تھا تو مجھ پر کتنا وقت گزر گیا!

ایک ہچکچاہٹ کے بعد میں غار کے داخلی راستے کی جانب بڑھا تو روشنی کی کرنیں مجھ تک پہنچ گئیں اور میرے اندر افکار روشن ہو گئے۔

میری حوصلہ افزائی ہوئی اور میں نے باہر نکلنے کا ارادہ کیا تاکہ میں اپنی پرانی جدوجہد جاری رکھ سکوں۔ جب تاریکی کی سازش نے دن کی روشنی میں ظاہر ہونے کی جرئات کر لی تھی تو روپوشی کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

مجھے ادراک ہو گیا کہ مونس کی زبان ان زبانوں سے مختلف نہ تھی جو ہمارے سامنے گزر چکی تھیں لیکن 'افسردگی آشکار کرنے والا آلہ' اس کی نگرانی کے لیے پروگرام نہیں کیا گیا تھا۔ وہ اسے آشکار کرنے سے قاصر تھا۔

تجربہ ایک خرگوش ہے!

عبدالقادر ایک پاؤں اٹھانیاور دوسرا نیچے رکھنے لگاتا کہ وہ اپنی قدموں کی اینٹھن کم کر سکے۔

اس کی آہیں جاری رہیں اور اس کے چہرے کے تاثرات سخت ہوتے گئے جو اس کے اعصاب پر دباؤ کو ظاہر کر رہے تھے۔

اس کے آگے دو سٹیشن رہ گئے تھے کہ اس کا دوست زین الدین سوار ہوا۔ یہ حقیقی معنوں میں دوستی تو نہیں تھی بلکہ محض ایک رفاقت تھی جو ایک سٹیشن سے دوسرے سٹیشن کے مابین رہتی تھی۔

اس کا آغاز ایک دن بس میں بات چیت سے ہوا تھا اور ایک ہی وقت پر بار بار اکھٹے سوار ہونے کی وجہ سے یہ اس انداز میں مضبوط ہوتی گئی کہ مزید آگے بڑھتی چلی جارہی تھی۔

عموماً ان کی باتیں ایک احساسِ مایوسی اور بلافائدہ روزگار کی تلاش کے لیے بھاگ دوڑ کے شکوہ شکایت میں ڈوبی ہوتی تھیں۔ لیکن عبدالقادر کا جذبہ دوسری ملاقات میں مختلف تھا۔ اس کے چہرے پر خوش گمانی کی جھلک تھی اور وہ زین الدین سے خوشی سے بولا:

"انھوں نے اس کام کے لیے میری نامزدگی قبول کرلی ہے۔ کمپنی کی انتظامیہ کے قاصد نے تصدیق کی ہے کہ میں مطلوبہ شرائط پر پورا اترتا ہوں اور اس سے زیادہ اسے اس بات کا اطمینان ہے کہ انھوں نے پیشہ ورانہ تجربہ کی شرط نہیں رکھی.. آخر کار، مجھے تابوت سے نجات مل جائے گی!"

"آجر پیشہ ورانہ تجربہ کی شرط رکھتے ہیں اور تجربہ بغیر کام کیے نہیں آتا۔ وہ ہماری خواہشات کے لیے ہمارے پیدا ہونے سے قبل ہی تابوت بنا دیتے ہیں۔ ہمیں اس کا ٹوٹنا مبارک ہو"!

"مقابلہ کے بعد تک مبارکباد ملتوی رکھو"۔

"کیا تم نے نہیں کہا کہ انھوں نے تمھاری قابلیت کی تعریف کی ہے؟"

اس بات نے ایک گونج کی مانند اس کے دماغ میں پس وپیش کی اور اس کے درد کا شور وغل اسے باقاعدہ محسوس کروایا۔

کچھ درد اس بارے میں سوچنے سے شدت اختیار کر جاتے ہیں لیکن وہ اس پر مجبور تھا۔ اس کے سامنے چند منٹ تھے کہ وہ ایک مخصوص سوال کا جواب دے: منظور یا نامنظور؟""""

پھپھڑے بس میں سے تقریباً اچھل رہے تھے۔ دھوپ نے بس کی دھاتی سطح پر دباؤ ڈالا اور اسے سلگا دیا تھا حتیٰ کہ جسم اور آنکھیں ڈھیلی پڑ گئی تھیں۔

اس نے ہوا کی تلاش میں اپنا سر کھڑکی کی جانب بڑھایا۔ اسے فکر ہو رہی تھی اس نے اکتاہٹ سے اپنی گردن کو چھوا۔ اسے لگا کہ اس کی جانب گھٹن والی ہوا آ رہی ہے۔ اس نے اپنے دل میں وہ دہرایا جو وہ عموماً ہر ناکامی کے بعد دہراتا تھا:

"!ہمیشہ ایک بے جان ممی ہوتی ہے جو محض پروں اور بازوؤں کو حنوط کیے جانے کی گواہ ہوتی ہے"

سٹیشن پر کچھ مسافر اتر گئے اور وہ ایک سیٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے یکدم اس پر اپنا تھکا ماندہ جسم رکھ دیا اور گہری سانس لی۔ اسے اپنے ساتھی کا سر سوار ہونے والوں میں نظر نہ آنے پر اچھا لگا لیکن ایک ہاتھ جسموں کے درمیان سے نکلا اور ایک چیتھڑے کی مانند اس پر آن لگا۔

جیسے ہی زین الدین نے اس تک سر کنا ممکن بنایا تو اس نے وہ سوال داغ دیا جس کا عبد القادر کو ڈر تھا:

"کیا میں مبارکباد دے دوں؟"

اس سوال نے عبد القادر کو یوں کھرچ دیا جیسے معدنی کنگھی شیشے کو کھرچ ڈالتی ہے۔

اس نے ہوا میں زور سے سانس لیا اور چپکے سے کہا:

"اس کے سنہ ہونے کی طرح اس کے ہونے کے جواب پر لعنت ہے"!

اس کے دماغ میں کام کی وہ تمام شرائط گھوم گئیں جو آجر نے ملاقات کے دوران پیش کی تھیں۔ اس کے احساسات شرائط کی تفصیلات کے درمیان بکھر گئے، پس گئے اور اسے اندر سے نچوڑ ڈالا لہٰذا اس مقابلہ کی تیزابیت جیسے اڑ گئی۔

اس نے اپنی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسائیں اور اپنی مٹھی کو بھینچا پھر بول اٹھا:

"لعنت میری قسمت پر"!

ڈرائیور نے یکدم بس کی بریک لگادی۔ سر آپس میں ٹکرا گئے اور جسم دائیں بائیں جھولنے لگے تو مسافروں کی گالیوں اور لعن طعن نے اس کی زبان کی لرزش کو جیسے اوجھل ہی کر دیا۔

عبد القادر جھلاہٹ سے ہکلایا:

"!لعنتیں انسان کا ہر جگہ اور کسی بھی وجہ سے پیچھا کرتی ہیں!لعنت ہی لعنت کو بند کر دیتی ہے!اور نعمت لعنت کا منہ بند کر دیتی ہے"

وہ کچھ دیر چپ رہا پھر اس کے الفاظ لال بیگ کے شکار سے بے بس کسی بلی کی میاؤں کی طرح گونجے:

"بنیادی طور پر کرۂ ارض پر موجودگی ہی ایک لعنت ہے"!

زین الدین نے پریشانی سے اس سے پوچھا:

"!کیا تم ٹھیک ہو؟"

اس نے اپنی نظریں باہر ایک قیمتی گاڑی پر گاڑ دیں جس میں سے بلند آواز موسیقی نکل رہی تھی۔ اس نے اسے اپنی بات کی تمہید بنالیا۔ اس نے اپنے ہونٹوں سے اس گاڑی کی طرف اشارہ کیا اور بولا:

"ہماری زندگی حد درجہ تمدن اور اس کے جدید فضلات کے اخراج کی وجہ سے آلودہ ہو چکی ہے! ان مقابلوں کے مالک بھی ہمارے ساتھ یوں ہی کرتے ہیں۔ وہ واضح طریقہ ہائے کار کے مطابق ہمیں حد درجہ شفافیت سے منہدم کر دیتے ہیں"۔

زین الدین نے اس کی آنکھوں میں غور سے جھانکا۔ ان میں جوش و خروش کی چمک چھپی تھی۔ اس نے عبد القادر کو ہمدردانہ لہجے میں پوچھا:

"کیا تم ٹھیک ہو؟"

عبد القادر نے اپنا سر نفی میں ہلا دیا اور بولا:

"مقابلہ تو تھا ہی نہیں"۔

زین الدین نے حیرانگی سے اسے پوچھا:

!"تمہیں کس لئے بلایا گیا تھا؟

عبد القادر طنزیہ انداز میں بولا:

"تاکہ دوڑ کے شیر کو روزگار کی قانونی حیثیت مل سکے۔ اس نے مقابلے کی کمیٹی کے سربراہ کو کی گئی اپنے ایک رشتہ دار کی فون کال کی وجہ سے صلح صفائی سے خرگوشوں کے مواقع نگل لیے۔

اس نے اپنی گردن کے اطراف پر ٹپکتے پسینے کے قطروں کو چھوا اور شدید طیش و غضب کے بعد بولا:

"!بہر حال، سفر بیکار نہیں تھا۔ مجھے ایک منفرد پیشہ ورانہ تجربہ حاصل ہو گیا ہے، خرگوش"

مٹی کی دھن

خالف نے اپنے ہاتھ سے سامنے والی پہاڑی کی جانب اشارہ کیا اور ڈرائیور سے کہا:

"اس موڑ کے پاس رکو جاؤ"۔

وہ دائیں بائیں دیکھنے لگا گویا کہ وہ اس جگہ سے حیرت زدہ ہو گیا تھا۔

دور سے اسے نئی رہائشی بستیاں نظر آئیں اور مرکزی شاہراہ پر غیر معمولی ٹریفک سے وہ چونکا اٹھا۔ اس جگہ نئی تفصیلات ظاہر ہو چکی تھیں یا شاید پرانی تفصیلات اس کے ذہن سے زائل ہو چکی تھیں۔ اس نے سالوں قبل گاؤں کا دورہ کیا تھا۔

اس نے گاڑی کے ٹرنک سے بیگ نکالے اور تیزی سے ان گھروں کی جانب جاتی ڈھلوان کی جانب لپکا۔ اس کے قدموں کا آہنگ اس وقت تک کم نہ ہوا جب تک وہ مرکزی شاہراہ سے سینکڑوں میٹر دور نہیں پہنچ گیا۔ گویا کہ وہ ڈرتا تھا کہ اس کا بیٹا اپنی رائے نہ بدل لے اور اس کا ساتھ دینے سے پیچھے نہ ہٹ جائے۔

وہ کھوئی ہوئی اور افسردہ نظروں سے اس کا تعاقب کرتا رہتا تھا اور اس کا بیٹا میانہ روی سے اس پر ردعمل دیتا تھا جبکہ طویل اصرار کے بعد وہ ناگواری سے اپنے باپ کا ساتھ دینے پر رضامند ہوا تھا۔

خالف نے بیٹے کی وجہ سے اپنے والدین کے ہاں آنا چھوڑ دیا تھا کیونکہ وہ ہر مرتبہ اس کے بیٹے کو دیکھنے پر اصرار کرتے تھے اور اس کے بس میں نہیں تھا کہ وہ ان دونوں کے لیے مزید بہانے گھڑے۔ کبھی وہ اپنی بیوی کے مرض کا اور کبھی اپنے بیٹے کی ٹریننگ

یا اس کے مدرسے کا اور کبھی اپنی مصروفیات کا بہانہ کرتا تھا۔ یہاں تک کہ اس کے عذر ختم ہو چکے تھے۔

والدین اپنی عمروں کی مسافتیں اس لیے طے کرتے ہیں تاکہ وہ اپنے بیٹوں کے پاس رہیں۔ اس لیے جو بات انھیں سب سے زیادہ تکلیف دیتی ہے وہ یہ ہوتی ہے کہ ان کے بیٹے ان سے دور فاصلے پر کھڑے ہو جائیں۔

حنالف گرمیوں کی چھٹیاں اپنے گاؤں میں گزارنے کا شدید متمنی تھا تاکہ اس کا بیٹا اس کے اور اپنے خاندان کے ہاں پرورش پائے اور اس کا بیٹا بھی ان دوروں کے لیے بے چین تھا جو اسے مختلف آب و ہوا میں لے جاتے تھے اور وہ وہاں سے تحائف اور خوبصورت یادوں کے ساتھ لوٹتا تھا۔

لیکن جب وہ تھوڑا بڑا ہوا تو 'تمھارا ملک'، 'تمھارا گاؤں' اور 'تمھارا خاندان' جیسی کسی چیز کا نام سننا پسند نہیں کرتا تھا۔ اس کے ذہن میں وہ جھگڑا گہرا نقش ہو گیا جو اس کے گاؤں کا دورہ کرنے کے بعد اس کے والدین کے درمیان چھڑ گیا تھا۔

وہ سولہ سال کا تھا۔ وہ ہر مرتبہ کی طرح اپنے والد کے ہمراہ خوش و خرم لوٹا لیکن گھر کے ماحول نے اسے اپنے احساس سے زیادہ عرصہ لطف اندوز ہونے کی اجازت نہیں دی۔ ایک چیخ پر وہ گھبرا کر اٹھ گیا جب اس کی والدہ اس کے والد سے کہہ رہی تھی:

"!دیکھو تم اس کو جینے اور یہاں اپنے دوستوں کی مانند ترقی کرنے کے موقع سے محروم کر رہے ہو! تم چاہتے ہو کہ اس کی پرورش ان کی طرح پسماندہ ہو"

اس کے والد نے اپنی شہادت کی انگلی ایک انتباہی انداز میں اس کے چہرے کے قریب کی اور جوش سے بولا:

"!دیکھو تم میرے خاندان کی توہین کر رہی ہو"

اس کی بیوی نے بھی اسی قدر جوش سے جواب دیا:

"میں اپنے اکلوتے بیٹے کی حفاظت کرنے کی کوشش کر رہی ہوں"۔
اس نے اپنی بیوی پر قہر آمیز نظروں کی جیسے بارش کر دی اور بولا:
"اس کے لیے تم سے زیادہ خطرناک کوئی نہیں ہے۔ تمھارے سب رویے چھچھورے اور ٹیڑھے ہیں۔ مگر میں کیا کہوں؟ تم جیسی کو خاندان کے مفہوم کی کیا قدر ہو سکتی ہے؟ بنیادی طور پر قصور میرا ہے۔ وہ میں ہوں جس نے تمھیں سڑک سے اٹھا کر کلبوں میں آوارگی کے خطرات سے تمھاری حفاظت کی۔ میں نے سوچا تم پاکیزہ ہو جاؤ گی اور ایک عورت بن جاؤ گی مگر کوڑا کچرا ہی رہتا ہے"
اس کے باپ نے یہ الفاظ ایک ہی دفعہ میں اس کی ماں کے منہ پر کہے اور جانے لگا لیکن وہ اس کے پیچھے ہولی اور جوش سے اسے بولی:
"تم ایک بیکار، نادار آوارہ کے سوا کچھ نہیں تھے۔ میری وجہ سے تمھارا گھر اور اقامت کے دستاویزات بنے"۔
اسے زمین سے کسی شے کے ٹکرانے اور پھر اپنی ماں کے چیخنے کی آواز آئی۔ وہ چیخ رہی تھی اور کہہ رہی تھی:
"!اے جانور تم نے مجھے تھپڑ مارا... اے (...) کے بچے! تم اپنی مالکن کو تھپڑ مارتے ہو بزدل! وحشی"
چیزوں کے ٹکرانے کے ساتھ ایک چیخ بلند ہوئی۔ ان دونوں نے آپس میں بچے پھنسا لئے اور جو جوان کی زبانوں اور ہاتھوں کی دسترس میں تھا وہ دونوں نے ایک دوسرے پر پھینک دیا۔ ان دونوں نے ایک دوسرے کے راز اور مکروہ اوصاف افشا کر دیے۔
ان دونوں کا بیٹا گھبرا گیا۔ اس کے بازو تکیہ کے گرد منجمد سے ہو گئے۔ اسے محسوس ہوا کہ جیسے غیر محفوظ ہونے کی وجہ سے گھر اس کے سر پر گرنے والا ہے۔

اسے لگا کہ گاؤں اور اس کے باسی ہی اس کیوالدین کے ایک دوسرے سے تعلقات میں خرابی کی وجہ ہیں۔ اس نے ان کا بائیکاٹ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ ہر اس چیز سے انکار کرنے لگا جس کا ان سے واسطہ تھا اور وہ جارحیت سے بھرپور غیر ملکی لکنت کے ساتھ اپنے والد سے کہتا تھا:

"مجھے صرف اس سے مطلب ہے کہ میں یہاں موجود ہوں۔ جو کچھ وہاں ہے وہ محض آپ کا ہے"۔

اس کے دادا کا اسے دیکھنے کا اصرار بڑھ گیا اور اس کی انکار پر ضد شدید ہوتی گئی۔ معاملہ اس کے والد کا اس سے یہ کہتے ہوئے التجا کرنے تک پہنچ گیا:

"میں تم سے التجا کرتا ہوں کہ تم میرے دنیا سے جانے سے پہلے میری ایک آخری خواہش پوری کر دو"۔

اس کا بیٹا بڑبڑایا:

"موت، صرف موت! آپ کو زندگی سے قائل کرنا نہیں آتا! مجھے نہیں سمجھ آتی کہ مداحوں کا موقف کیا ہو گا جب وہ یہ جانیں گے کہ ان کا پسندیدہ فنکار (سی دو) اپنی چھٹی ایک خستہ حال کونے میں گزارتا ہے۔ اس کا فن سے کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ ہی زندگی سے"!

پکی سڑک نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

اب اسے پیچھے مڑ کر دیکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔

وہ اترائی، چڑھائی اور خمدار موڑوں سے ہوتے ہوئے مختلف پہاڑی راستوں میں گھستے گئے اور گاؤں سے قریب تر ہونا جیسے ان کے لیے امن و سلامتی کی بہتر علامت بن چکا تھا۔

کچھ دور پیدل چلنے کے بعد اس کے بیٹے کے ناک تک جنگل کی خوشبوئیں پہنچیں جن میں تیز حیوانی بو بھی شامل تھی اور یہ خوشبوئیں ہلکی بارش میں بھیگی مٹی کی مہک اور خوش کن خوشبو پر غالب آ چکی تھیں۔

تاہم فنی مجسموں کی مانند یہاں وہاں بکھری چٹانوں کے منظر نے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کروالی۔ اسے شاہ بلوط کے درختوں میں چھپے بندروں کا مشاہدہ کرنا اچھا لگا جو اپنے زنگ آلود دانتوں سے اس کو چڑا رہے تھے۔ اسی طرح اسے صحرائی خرگوشوں کی چھلانگیں پسند آئیں جو اس کے سامنے سے بجلی کی کوند کی مانند گزر جاتے تھے۔

اس کے کانوں تک ایک خوش آہنگ منفرد ہمنوائی پہنچ رہی تھی جس میں پانی، درختوں کی سرسراہٹ، پرندوں کی چہچہاہٹ، حشرات کی چرچراہٹ اور ہلکی ہوا کی سنسناہٹ شامل ہو رہی تھی اور اس کے تخیل کو جلا بخش رہی تھی۔

مگر وہ تب بھی ایک گریزاں شخص ہی تھا جسے اپنا وجود ایک ایسی جگہ قبیح لگ رہا تھا جس کے بارے میں اس کے سوا کچھ نہیں جانتا تھا کیونکہ اس کے والدین نے اس کے لئے وہ جگہ بیان کی تھی اور اس کے پرانے تخیل نے وہاں کے لوگوں کے متعلق ایک تصور راسخ کر لیا تھا کہ ان لوگوں کے گھر بھیڑ بکریوں کے باڑے سے ملتے جلتے ہیں اور وہ ایسے سانس کا اخراج کرتے ہیں کہ غبار کی مانند زمین و آسمان کے مابین معلق اس بات کے منتظر رہتے ہیں کہ بادل اس کے حال پر رحم کریں اور برس پڑیں، جس سے وہ نیچے زمین پر اتریں اور پھر ہمیشہ کے لیے ابدیت کے بستر پر براجمان ہو جائیں۔

وہ دونوں زیتون کے ایک بڑے درخت کے پاس پہنچے تو خالف رک گیا اور خوشی سے بولا:

"میں یہاں بربط بجایا کرتا تھا۔ میں نے تب تک موسیقی کی تعلیم حاصل نہیں کی تھی اور نہ موسیقی کے کسی ادارے میں داخل ہوا تھا"۔

اس کے بیٹے نے لاپروائی سے اپنا سر ہلایا اور غصے سے دھاڑا:

"جو آپ کو سنتا ہے آپ کو (موزارٹ) اور (بیتھوون) سمجھتا ہے! آپ کسی خستہ حال ریستوران میں بربط بجانے والے کے سوا کچھ بھی نہیں ہیں"۔

حنالف خوشی سے مزید بولا:

"تمہارے دادا بہت خوش ہوں گے۔ ہمارے مابین آخری رابطے میں انہوں نے مجھے بہت ڈانٹ پلائی۔ انہوں نے مجھے واضح الفاظ میں کہا 'حنالف کے بغیر مت آنا'! گویا کہ مجھے دیکھنا ان کے لئے کوئی معنی نہیں رکھتا"!

"!حنالف نہیں، (سی دو)"

اس کے بیٹے نے اپنی ناراضی پر زور دیتے ہوئے باپ کی طرف ایسی نظروں سے دیکھا جو اسے متنبہ کر رہی تھیں کہ اس بات کا اسے کوئی فائدہ نہیں کہ وہ اس کے اور اس کی ماں کے درمیان جاری جھگڑوں کی کسی بھی وجہ کا اس سے ذکر کرے۔

اس کی پیدائش پر اس کے والد نے اصرار کیا تھا کہ اس کا نام اپنے والد کے نام (حنالف) پر رکھے جبکہ اس کی ماں بضد تھی کہ اس کو اپنے والد (لیونارڈ) کا نام دے۔ اس لئے ان دونوں نے اسے دونوں کا نام (لیونارڈ حنالف) دینے کا فیصلہ کیا لیکن اس سے مشکلات حل ہونے کی بجائے معاملہ پیچیدہ ہو گیا۔ والدین کا ان دونوں میں سے کسی ایک نام سے اسے پکارنا دوسرے کو بھڑکا دیتا اور جھگڑے کا سبب بن جاتا۔ والدین کے جھگڑوں نے اسے اس نام اور تمام ناموں سے بیزار کر دیا۔ اس نے اپنے لیے سی دو نام کا انتخاب کر لیا جس سے وہ اپنے دوستوں میں مشہور تھا۔ پھر ایک گلوکار بننے کے بعد یہی اس کا فنی نام بھی بن گیا۔

ایک دن کسی صحافی نے اس سے اس کے نام کا مطلب پوچھا تو اس نے جواب دیا:

"میں نے موسیقی کے دو راگوں (سی) اور (دو) کو اکٹھا کر لیا ہے"۔

"کیوں؟"

"میرا خواب ہے کہ میں دو راگوں سے پیدا ہوتا۔ ایک نرم و نازک شے جو مجھے کائنات میں محبوب ہے"۔

اس کے والد کے پریشان تاثرات سے لگا کہ وہ اس کے دماغ میں گھومتے افکار کو بھانپ گیا ہے۔ اس نے التجائی انداز میں اسے کہا:

"اس کا تذکرہ اپنے دادا کے سامنے نہ کرنا۔ اس عمر میں ان کا دل معمولی باتوں سے مغموم نہ کرو"۔

اس نے جوش سے رد عمل دیا:

"!بطور انسان میرا تشخص ایک معمولی چیز ہے"

خلاف نے قدرے طنزیہ انداز میں جواب دیتے ہوئے مزید کہا:

"پسماندگی معمولی باتوں سے عشق کرتی ہے اور ان کی بڑائی میں مبالغہ آرائی سے کام لیتی ہے"۔

خالف نے اس کے جارحانہ لہجے کی پروا نہ کی۔ ایک دوسری چیز تھی جو اسے مصروف رکھے ہوئے تھی جو اس کیا اپنے والد (خلاف) کا ہر دورے میں اس کے ساتھ رویہ تھا۔ وہ ابھی بھی انہیں ایک شرارتی بچے کے طور پر لیتا تھا جسے ساٹھ سال کی عمر تجاوز کر جانے کے باوجود رہنمائی اور تادیب کی ضرورت تھی۔ جس چیز سے اسے زیادہ ڈر لگتا تھا وہ یہ تھی کہ اس کی زبان اپنے بیٹے کے سامنے ان معمول کے الزامات کے بارے میں نہ پھسل جائے کہ اس نے اپنے والد کی حکم عدولی کی اور اپنے چچا کی بیٹی کو اپنی شادی کے چند ماہ بعد طلاق دے دی تھی۔

اس قصے کو سالوں گزر چکے تھے اور اس کے باوجود کہ اس لڑکی نے اپنے چچا کے بیٹے کے ساتھ شادی کر لی تھی اور اس کے ہمراہ بیٹوں پوتوں کا ایک قبیلہ تشکیل دے ڈالا

تھا مگر وہ اب تک اسے قربانی کا بکرا سمجھتا تھا اور خود کو وہ ناسمجھ جس نے اپنے ہی گھر کو اپنے سر پر گرا لیا تھا۔

قبل ازیں وہ کبھی بہانے بنا کر اور کبھی اپنے موقف کا دفاع کر کے اس معاملہ سے نپٹ لیتا تھا مگر اب اسے نہیں پتا تھا کہ وہ کیا کہے۔ اسے محسوس ہوتا تھا کہ وہ باہم گڈمڈ فیصلوں اور حالات کا شکار ہے۔ اس نے پہلے ہی ایسے نقصانات کی تکلیف اٹھالی ہے جن کا اظہار آسان نہیں ہے۔

اس وقت آسان نہیں تھا کہ وہ اس محترم حلاف سے احکامات پر بحث کرے جس کی بات رد کرنے کی جرات کوئی نہیں کرتا تھا۔ مگر اسی طرح ایک نازک و حساس سازندے کے لیے آسان نہیں تھا کہ وہ اپنے قبیلے سے منہ موڑ لے اور خوبصورت (فرانسواز) کو بھول جائے جو اپنی تہذیب، نسوانیت اور واشگاف خواہشات کی وجہ سے مکمل طور پر اس کے شانہ بشانہ چلتی تھی۔

اس کے اور اس کے چچا کی سادہ لوح بیٹی کے مابین احساسات کا فرق واضح تھا جس کا نسوانی سرمایہ اپنی دلکشی میں کم تھا۔ چند شرمیلی نظریں دیہات کے کسی نوجوان کو اس کے عورتوں اور زندگی کو دریافت کرنے کے آغاز میں قائل کرنے کے لیے کافی ہو سکتی تھیں لیکن کسی ایسے بالغ شخص کو راضی نہیں کر سکتی تھیں جو ایک بڑے یورپی شہر میں رہتا ہو جس میں جنات یوں خواہشات پھونکتے رہتے ہیں جیسے زمین غبار کو پھونکتی رہتی ہو۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اب وہ اپنے والد کے تبصروں سے ناراض نہیں ہوتا تھا کیونکہ وہ انہیں معمولی سمجھتا ہے اور چونکہ وہ اس کو ایک سیخ کی مانند کھڑچ ڈالتے ہیں، اسے اپنے نقصانات یاد دلاتے ہیں کہ کیسے اس کی زندگی فرانسواز کے ساتھ جاری رہی اور کیسے ختم ہو گئی۔ فرانسواز نے دس سال بعد اپنے بیٹے کی عمر کے ایک نوجوان

کی وجہ سے اس سے بے وفائی کی اور علاوہ ازیں اس کی آدھی جائیداد پر بھی قبضہ کر لیا۔

اسے لگنے لگا کہ دل کا انتخاب ہمیشہ مثالی انتخاب نہیں ہوتا!

اور اس کے سامنے بے چینی و تباہ کن دلکشی کے علاوہ محبت کی دوسری مختلف تفصیلات بھی آشکار ہو گئیں کیونکہ محبت تو سلامتی اور راحت کے احساس کا ایک نام ہے۔

"یہ کیا چکر ہے؟ بس پیدل چلتے جا رہے ہیں اور ابھی تک ہم پہنچے ہی نہیں؟ ڈھلوان کے بعد ڈھلوان! ہم کہاں اتریں گے؟ زمین کی اتھاہ گہرائی میں؟"!

اس کے بیٹے کی آواز نے اس کے خیالات کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ اس نے جوش سے اس لمحے کی مناسبت سے جواب دیا:

"وہ بچھو تمہاری ماں ہے جس نے تمھارے احساسات میں ہر شے کے بارے میں زہر بھر دیا ہے۔ وہ خوبصورتی سے انکاری ہے۔ اچھا نہیں کہ وہ تمھیں بتائے کہ کیسے میرے اہل خانہ اس کے ساتھ ایک ملکہ جیسا برتاؤ کرتے تھے۔ کتنے تحائف اور نعمتیں تھیں جن کے ہمراہ وہ ان کو ملنے کے بعد واپس آتی تھی۔ مگر میں کیا کہوں؟ دھوکہ دہی اس کے خون میں ہے"۔

اس کے بیٹے نے ناگوار نظروں سے اسے دیکھا۔ اسے اچھا نہیں لگا کہ اس کا باپ اسے آہستہ آہستہ اس مقام پر لے جائے جہاں وہ جانا نہیں چاہتا تھا کیونکہ وہ اسے اپنی ماں کے خلاف بھڑکانا چاہتا تھا۔ اسے جو بات سب سے بری لگتی تھی وہ ان دونوں میں سے کسی ایک کے ساتھ تنہا ہونا تھا کیونکہ وہ اس دوران ایک دوسرے کے خلاف بغض و حسد نکالتے رہتے تھے۔

"کیا کوئی خوبصورت یادیں نہیں ہیں جن کو میرے پاس بطور امانت رکھ دیں؟"

یہ سوال اسے چبھا تو اس نے چلنے کی رفتار تیز کر دی اور باپ سے کئی میٹر آگے نکل گیا۔ وہ پتھر جو ان دونوں کے پاؤں سے ادھر ادھر اڑ رہے تھے ان کی گڑگڑاہٹ نے الفاظ کی جگہ لے لی۔ آخری پہاڑی چوٹی اس کے دادا کے گھر کی دہلیز کے پاس تھی۔

اس کے دادا نے اپنے بازو پورے کھول دیے اور کہا:

"!خلاف، میرے بچے! تم تو مرد بن گئے ہو! ان شاءاللہ تم اپنے والد اور اجداد کے گھر کو برکت دو گے"

اس نے دادا کو گرمجوشی سے رد عمل نہیں دیا۔ وہ دادا کے بازوؤں میں لکڑی کی مانند لگ رہا تھا۔ خلاف کے دادا کو اس کے سر پر ابھار سا محسوس ہوا تو انھوں نے اسے خود سے تھوڑا دور کیا اور کہا:

"!یہ دُم کیا ہے! تمھارے بالوں کو تراشنے کی ضرورت ہے۔ تم ایک مرد ہو۔ بری بات ہے اگر تم اپنے بالوں کو عورتوں کی طرح لمبے کرو"

اس نے قدرے گھبراہٹ سے اپنے والد کی طرف دیکھا اور اپنی غیر ملکی لکنت میں بولا:

"!پسماندگی کے مظاہر شروع ہو گئے"

اس کے والد کا چہرہ مرجھا گیا۔ وہ ڈر گیا کہ اس کا باپ اس کی بات کو سمجھ نہ جائے اس لئے وہ جلدی سے ان سے بولا:

"!اس نے ایک فلمی کردار کے لیے ان کو لمبا کیا ہے۔ آپ کا پوتا اب ایک سٹار ہے"

اس کے دادا نے اس کی طرف مزید گہری نظروں سے دیکھا اور کہا:

"!تمھاری نگاہوں میں کلی طور پر ایک سنجیدگی ہے! ان میں اپنے دادا کی طرح عزم اور وقار ہے"

خلاف کا دادا اپنے بیٹے اور اس کے چچاؤں سے بات چیت کرنے لگا جبکہ خلاف گھر کے تمام کونوں پر نظر دوڑانے لگا۔ اس کی نظر اینٹوں سے بنی دیواروں، سیمنٹ سے پختہ کئے گئے فرش اور روایتی سادہ فرنیچر پر گھوم رہی تھی تو وہ ہکلاتے ہوئے بڑبڑایا:

"!میں اس بُو کو جس میں سانس لینا مشکل ہے کیسے ایک پورا ہفتہ برداشت کروں گا"

"تم نے کیا کہا بیٹے؟"

اس کے دادا نے فوراً سوال کیا۔ وہ کسی بھی ایسے لفظ کو سننے کے مشتاق تھے جو مختلف ہو گویا کہ وہ شہد کشید کرنا چاہ رہے تھے۔ اس کے دادا کو اس کی غیر ملکی زبان پر عبور نہیں تھا مگر وہ جملوں کے مفہوم کو ان کے سیاق سے سمجھ رہے تھے۔

وہ مزید ان کے ساتھ نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ اس نے اپنا بربط پکڑا اور قریبی پہاڑی کی طرف نکل گیا۔ ایک درخت پر چڑھا اور اوپر سے اس جگہ کا جائزہ لینے لگا۔ اس کا احساس و شعور ان سرسبز کھیتوں کی مانند پھیل گیا جو مختلف درختوں، پھولوں اور نباتات سے مزین و مرصع تھے۔ اس کا سینہ تازہ ہوا کے لیے جیسے کھل گیا۔

اس نے ریڈیو چلایا اور اپنے بربط کی تاروں سے کھیلنے لگا۔ کبھی وہ ساز بجاتا اور کبھی خبروں سے لطف اندوز ہوتا۔

تعلیمی پروگرام، اشتہاروں کے وقفے، گانے چلتے گئے اور خبروں کا وقت آ گیا۔

اناؤنسر کی کانپتی ہوئی آواز آئی:

"!شہر کے ایک قہوہ خانہ میں بم پھٹا ہے"

اس کا دل تقریباً اس کی پسلیوں میں سے باہر آنے لگا تھا۔ سب سے پہلے اسے جن دو لوگوں کی فکر ہوئی وہ اس کی ماں اور منگیتر تھیں۔

"ہیلو، امی آپ خیریت سے ہیں؟ ہو کیا رہا ہے دراصل؟"

اس کی ماں نے پریشانی سے اسے کہا:

"میرے بیٹے فوراً واپس آجاؤ! وہ تم سے ضرور انتقام لیں گے۔ وہ احمق ایک مخبوط الحواس بوڑھے کی خاطر تمھاری زندگی کو خطرے سے دوچار کر رہا ہے"۔

اس سے اپنی منگیتر سے رابطہ کیا اور بے چینی سے بولا:

"(لیلیان)، کیا تم خیریت سے ہو؟

اس نے غیر معمولی خشک انداز میں جواب دیا:

"میں خیریت سے کیسے ہو سکتی ہوں جب تم لوگ وہاں سے اپنی دہشت وبربریت ہمارے لیے برآمد کر رہے ہو؟"!

اس نے اپنے دوستوں سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تاکہ ان کی طرف سے مطمئن ہو جائے مگر ان کا ردعمل بھی منگیتر کے جواب سے بہتر نہ تھا۔ ان میں سے کچھ نے اکتاہٹ سے ردعمل دیا اور کچھ نے اس کی کال کو نظر انداز ہی کر دیا۔

وہ نہیں جانتا تھا کہ کس سے رابطہ کرے اور کیوں رابطہ کرے۔ کئی روز وہ پریشان ومضطرب رہا پھر اس نے اپنے باپ سے گھبرا کر پوچھا:

"کیا وہ شخص جس نے قہوہ خانہ کو اڑایا ہے واقعی ہم میں سے تھا؟"

ہم میں سے کی عبارت بے ساختہ اس کے منہ سے نکل گئی مگر اس نے والد کے اندر اطمینان کا ایک احساس بھیر دیا۔ اس نے شفقت سے اس کا کندھا تھپتھپایا اور کہا:

"کیا تم نے آج کا اخبار نہیں پڑھا؟ تحقیقات نے سراغ لگایا ہے کہ وہ ان میں سے ہے۔ کاش وہ ہمارے بارے میں اپنے بیکار شکوک وشبہات کو ختم کر دیں اور اس بات کا ادراک کریں کہ ہم میں سے اکثر وہاں زندگی کے مقصد کے لیے جاتے ہیں، نہ کہ موت کی خاطر"۔

اس نے اپنی بربط اٹھائی اور کھیت کی طرف نکل گیا۔ یہ اس کی عادت بن گئی کہ وہ اپنی موسیقی کو پانی، درختوں کی سرسراہٹ، ہوا کے جھونکوں، آواز کی بازگشت کے ساتھ ہم آہنگ کرتا اور وہ الفاظ دہراتا جو اس کی طبیعت کو بھلے لگتے تھے۔

کچھ دن بعد ٹیلی فون بجا۔ اس کے منیجر نیا سے متنبہ کیا:

"تقریب میں صرف چند دن باقی ہیں"

اس نے قدرے خشک لہجے میں کہا:

"میں واپس نہیں آؤں گا"۔

اس کے منیجر نے اسے حیرت سے کہا:

"یہ پاگل پن ہے! اس کی وجہ سے ہمیں بہت نقصان اٹھانا پڑ جائے گا۔ ہم نے معاہدہ پر دستخط کیے ہوئے ہیں اور ہم پر کچھ ذمہ داریاں ہیں"۔

اس نے لاپروائی سے جواب دیا:

"کام میری شرکت پر موقوف نہیں ہے۔ وہاں دوسرے بھی تو ہیں"۔

"ہرگز نہیں۔ تقریب کے منتظمین نے صرف تمھاری شرط لگا رکھی ہے۔ تم اب نوجوان نسل کے سٹار ہو"۔

"وہ شرط لگا رہے ہیں! کس پر؟ خلاف پریا (سی دو) پر؟"

"..."

"کس پر؟"

"الفاظ کا کھیل بھول جاؤ۔ اپنی کامیابی اور شہرت کے سوا کچھ نہ سوچو"!

"..."

خلاف نے ٹیلی فون کا ریسیور رکھ دیا اور یکدم اپنے جسم کو زمین پر دراز کر دیا۔ اپنے دادا کی طرح وہ آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا اور اپنی نظریں دور افق پر جما دیں۔

اس کی انگلیاں بے ساختہ ایک ایسے انداز میں مٹی میں دھنس گئیں جن سے لگ رہا تھا کہ وہ اس مٹی میں سے کوئی فیصلہ بر آمد کرنے لگا ہے۔ پھر وہ حیرت زدہ نظروں سے بڑبڑایا:

"!مٹی کی دھن"

اس نے اپنی بربط کو گلے سے لگالیا، اپنی انگلیوں سے اس کی تاروں سے جیسے باتیں کرنے لگا اور بار بار بولنے لگا:

میں تمھارے پاس اپنی سالگرہ کی مناسبت سے ساز بجانے آیا ہوں،""

کیا تم صلح کرو گی؟

اے پاک سرزمین

کیا تم قبول کرو گی؟

میری پہل

ماتھے پر بوسا""

پرندے کا دماغ برائے نیلامی

شہر کا قہوہ خانہ گاہکوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔

اچانک سب کی نگاہیں (لرزق) اور (زرقو) کی میز پر جم گئیں۔

ان دونوں کی آواز بلند ہوئی اور انھوں نے آپس میں گالیوں والزامات کا تبادلہ شروع کر دیا تو لوگوں نے جھگڑا ختم کروانے کے لیے مداخلت کی۔

لرزق بھڑک کر بولا:

"! مجھے حماقت کا وہ کلک توڑنے دو جو اس کے دونوں کندھوں نے اٹھا رکھا ہے"

زرقو نے تحکمانہ لہجے میں جواب دیا:

"اسے تجربہ کر لینے دو کہ کیسے ایک لال بیگ رسوا ہوتا ہے"!

لوگوں نے ان دونوں کو حیرت سے پوچھا:

"ہو کیا رہا ہے؟ ہم نے تو تم دونوں کو باہم شیر و شکر ہی دیکھا ہے"۔

لرزق نے اپنے ہم نشین پر غضبناک نظریں ڈالیں اور کہا:

"میں کسی بھی مخلوق کو، وہ کوئی بھی ہو، اجازت نہیں دوں گا کہ وہ (براقہ) کی مبارک کرامات پر شک کرے"۔

زرقو نے جوش سے کہا:

"پہل کرنے والا زیادہ ظالم ہوتا ہے، وہ تم ہو جسے تمہاری جہالت نے اکسایا کہ تم غیر معمولی، زمانوں اور براعظموں سے ماوراء (ادولفا) کو تکلیف پہنچاؤ"

لوگوں نے طنزیہ نظروں کا تبادلہ کیا اور آپس میں سرگوشی کی:

"یہ ساری لڑائی دو سواریوں کی وجہ سے ہے"۔

لرزق نے ملامت میں ڈوبے لہجے میں کہا:

"!اگر تم لوگ (براقہ) کی برکت کی قدر کرتے تو گاؤں کا وہ حال نہ ہوتا جو آج ہے"

زرقو نے اپنے ہونٹوں کو بھینچا پھر انہیں ڈھیلا چھوڑ دیا اور ناراضگی سے بولا:

"جاہل کی نظر میں سونا اور پیتل برابر ہوتے ہیں"۔

لوگوں نے ایک دوسرے کی طرف لاپروائی سے دیکھا پھر ان میں ایک نے ایسے لہجے سے کہا جس میں بظاہر مدد تھی مگر اس میں تمسخر چھپا تھا:

"!ہمیں ثبوت چاہیے"

زرقو دلچسپی لیتے ہوئے بولا:

"کیسے؟"

ان میں سے ایک نے جواب دیا:

"ان دونوں سواریوں کی شہر کی طرف دوڑ لگواؤ تاکہ ہم اس کی حقیقت دیکھ سکیں جو تم دونوں دعویٰ کر رہے ہو"۔

لرزق اور زرقو کو اس خیال نے جوش دلا دیا اور ان کی باہمی بغض و عداوت شدت اختیار کر گئی اور معاملہ یہاں تک پہنچ گیا کہ ان دونوں نے وہ شرط لگا دی جس کا کسی کو گمان بھی نہیں تھا۔ زرقو نے قطعیت سے اعلان کیا:

"اگر مافوق الفطرت (ادولفا) (براقہ) سے ہار گئی تو میں سرعام اس کو ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا"۔

لرزق بھی پر اصرار انداز میں بولا:

"اگر مبارک (براقہ) دوڑ ہار گئی تو میں اسے فوراً پہلے راہ گیر مسافر کو بخش دوں گا"۔

مرغ کی بانگ نے دوڑ کے آغاز کا اعلان کیا۔

وہ دونوں شائقین کی تالیوں تلے شہر کی جانب روانہ ہو گئے۔

ان دونوں میں سے ہر کوئی اپنی سواری کو آگے بڑھانے کے لیے زور لگا رہا تھا جبکہ اس کی نظریں اپنے مدمقابل سے بھی نہیں ہٹ رہی تھیں۔

راستے کا کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد (براقہ) کو تھکاوٹ محسوس ہونے لگی تو اس کے اعصاب ڈھیلے پڑنے لگے اور وہ راستے کے کنارے پر اڑ گئی۔

اس کے برعکس (ادولفا) کی رفتار ایک شدید ڈھلوان کے قریب تیز ہو گئی اور اس کے بریک جم گئے تو زرقو مجبور ہو گیا کہ اس کے رخ کو ایک ذیلی راستے کی جانب موڑ دے۔

سورج تو جیسے آسمان کے جگر کو جلا گیا تھا اور جلا دینے والے شعلے پھینکنے لگا تھا۔

ہوا نے زور و شور سے لرزق کے جسم سے پسینہ کشید کرنا شروع کر دیا اور وہ (براقہ) کو اس کی جگہ سے ہلانے میں ناکام ہو گیا۔ وہ زمین پر بیٹھ گئی اور لرزق نے اس پر اپنا سر رکھ دیا تو اسے غنودگی نے آن لیا اور پھر اس نے خود کو نیند کے حوالے کر دیا۔

بعد ازاں ایک ٹرک انجن کی گونج دار آواز ہی لرزق کو بیدار کر سکی۔ اس نے ٹرک والے کو ہاتھ کا اشارہ کیا تو اس نے ٹرک روکا اور ایک قریبی سڑک پر کھڑا کر دیا۔ لرزق تیزی سے اس کی جانب گیا اور اس سے یہ کہتے ہوئے مدد مانگی:

"ہم دونوں کو تھکاوٹ، پیاس اور بھوک نے آن لیا ہے۔ کیوں نہ آپ ہم دونوں کو کسی ایسی جگہ پہنچا دیں جہاں ہماری حاجات پوری ہو جائیں؟"

ڈرائیور نے اس صافہ کو درست کیا جس سے اس نے اپنا نصف چہرہ ڈھانپ رکھا تھا پھر تیز نظریں سواری پر گاڑ دیں جو آرام سے اپنی ٹانگیں زمین پر پھیلائے پڑی تھی اور بولا:

"کیا اس کا تمھارے ساتھ طویل وقت بیتا ہوا ہے؟"

لرزق نے گرمجوشی سے کہا:

"یہ زندگی بھر کی رفاقت ہے۔ یہ ایک نادر مخلوق ہے جس کی اصل ایسے ریوڑ کی طرف لوٹتی ہے جس پر ایک دن (براق) منڈلایا تھا تو اس پر برکت و رحمت نازل ہو گئی تھی۔ جہاں کہیں یہ اپنے قدم رکھتی ہے وہاں خیر و برکت ہو جاتی

ہے۔ اس نسل میں سے سوائے دو کے کوئی نہیں بچا۔ اسی لیے فراخدلانہ پیشکشوں کے باوجود میں اس سے اترنے سے آج تک انکاری ہوں۔"

لرزق نے (براقہ) کی مدح میں مبالغہ آرائی کر دی لیکن اس شخص کی نظریں پھر بھی جامد اور دلچسپی سے خالی رہیں۔ اس نے لرزق کو اس سوال سے حیران کر دیا:

"کیا تم نے اس کی آنکھوں پر غور کیا ہے؟"

"ان کو کیا ہوا ہے؟"

"کیا تم نے اس پر (فخچر بنائے جانے) بیماری کی علامات ملاحظہ نہیں کیں؟"

)"فخچر بنایا جانا"!(

"یہ ایک خطرناک و مہلک وائرس ہے جو انسان اور حیوان کو لگ جاتا ہے۔ یہ اچھے بھلے حالات میں بھی مصائب اور بگاڑ چھوڑ جاتا ہے۔"

لرزق تھوڑا پیچھے ہٹا اور نظریں (براقہ) اور اپنے مخاطب کے درمیان دوڑائیں تو اسے لگا کہ سواری میں تھکاوٹ کے ساتھ ساتھ کچھ کمینگی کی جھلک نظر آ رہی تھی۔ اس نے قدرے پریشانی سے خود کو کہا:

"کیسے ممکن ہے کہ یہ کسی وبا کا شکار ہو جائے جبکہ میں تو اسے تمام مخلوقات سے الگ تھلگ رکھتا ہوں؟"۔

اس نے احتیاط سے اس کی جانب قدم بڑھائے۔ غور سے اس کی آنکھوں میں دیکھا تو اسے ان کی سفیدی میں سرخ دھاگے نظر آئے۔ اس نے اپنی سماعت کو اس کی سانسوں پر مرکوز کیا تو ان کو بھی ناتواں اور مضطرب پایا۔

اس پر شک حاوی ہو گیا تو وہ پریشانی سے ڈرائیور سے بولا:

"یہ تو تھکاوٹ کی علامات ہیں"!

ڈرائیور نے طنزیہ لہجے میں بولتے ہوئے اسے جواب دیا:

"اے آدمی تم کہاں زندگی گزار رہے ہو؟ (خچر بنائے جانا) کی بیماری آج کل پورے علاقے میں زور پکڑ رہی ہے۔ جلدی سے اسے قریب ترین جانوروں کے ڈاکٹر یا شمشان گھاٹ لے جاؤ کیونکہ اس کا آزاد پھرنا انسانوں اور ملک کے لئے خطرناک ہے"۔

خوف لرزق کے دل میں سرایت کر گیا اور وہ ڈرائیور کی بات کی تصدیق کی طرف مائل ہونے لگا۔ وہ دوبارہ (براقہ) کے قریب گیا اور اپنی نظروں سے ہی اس کی دُم سے سر تک جیسے اس کی رگڑائی کر ڈالی تو وہ سواری اسے مرجھائے کانوں، کانپتے ہونٹوں اور کٹی پھٹی تیوریوں والی لگنے لگی۔

اس کے دماغ میں خوف بڑھنے لگا اور اس نے شکست خوردگی سے ڈرائیور سے کہا:

"میں آپ سے التماس کرتا ہوں کہ میری رہنمائی کرو"۔

ٹرک والے نے اس کا کندھا تھپتھپایا اور کہا:

"تم ایک بھلے آدمی لگتے ہو اور شاید اللہ نے تمہاری کسی نیکی کی وجہ سے مجھے تمہارے راستے میں بٹھا دیا۔ میں تمہیں اس کی قیمت دوں گا اور پھر اسے کسی تجرباتی لیب کے حوالے کر دوں گا۔ کوئی بھی شے انسانیت سے مہنگی نہیں ہوتی"!

لرزق نے (براقہ) کی قیمت وصول کی۔ پھر اترے ہوئے چہرے اور مضطرب اعصاب کے ساتھ ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر جا بیٹھا۔ بہر حال اس کا دھیان دوڑ اور اس مقام پر اٹکا ہوا تھا جو جیت کے بعد زرقو گاؤں میں حاصل کرنے جا رہا تھا۔ اسے افسوس ہو رہا تھا کہ قسمت زرقو کو ایک آسان جیت پیش کر دے گی۔

اس کے خواب و خیال ہی نہ تھا کہ زرقو بھی اس جیسی صورتحال سے دوچار ہیگیونکہ اسے (ادولفا) ایک بل کھاتی ڈھلوان تک لے گئی جو کنکروں اور گڑھوں سے

بھری ہوئی تھی۔ (ادولفا) دائیں بائیں جھوم رہی تھی اور زرقو اس پر اونچا نیچا ہو رہا تھا حتی کہ اس کا دل تقریباً باہر آنے والا تھا اور اسے موت کا یقین ہو چلا تھا۔

وہ معجزاتی طور پر بچ گیا۔ (ادولفا) کی حرکت ایک درخت کے تنے سے چند سینٹی میٹر قبل رک گئی اور قسمت زرقو کے پاس ایک آدمی لے آئی جس نے وہاں سے نکلنے میں اس کی مدد کی۔

اس آدمی نے اپنے صاف کو چھوا جس سے اس نے چہرے کا نچلا نصف ڈھانپ رکھا تھا اور اسے بولا:

"میں اللہ کا بہت شکر ادا کرتا ہوں کہ یہ تمہارے ساتھ پھٹ نہیں گئی"۔

زرقو نے اپنی پیشانی پر بل ڈالے اور احتجاج کرتے ہوئے بولا:

"مجھے پتا ہے کہ یہ میرا ساتھ نہیں چھوڑے گی۔ یہ کوئی گاڑی نہیں ہے۔ اس کی ایک پرانی تاریخ ہے۔ یہ میرے والد کو دادا سے وراثت میں ملی تھی۔ میرے دادا جڑی بوٹیوں سے علاج کرنے میں ماہر تھے اور انہوں نے ایک مشہور مصور کی بیٹی کو کسی ناقابل علاج جلدی مرض سے نجات دلائی تو اس نے انہیں (ادولفا) کا تحفہ دیا۔ یہ وہی ہے جس پر ہٹلر اپنی وفات سے قبل سوار ہوا تھا۔ یہ عظیم لوگوں کی وراثت میں رہی ہے۔ یہ قوت اور جاہ و جلال کی علامت ہے۔ جوں جوں اس کی عمر بڑھتی جا رہی ہے اس کی قیمت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے"۔

وہ آدمی لاپروائی سے مسکرایا اور بولا:

"ایک ایسے خطرناک مادے کی وجہ سے جو اس کے انجن کو بنانے میں استعمال ہوا ہے اس قسم کی گاڑیوں کو بین الاقوامی طور پر ممنوع کر دیا گیا ہے کیونکہ وہ مادہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دھماکہ خیز بن جاتا ہے۔ میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ اس سے فوراً چھٹکارا حاصل کر لو!"

زرقو نے سواری کے گرد ایک سے زیادہ چکر لگائے اور اپنی آنکھوں سے اس کی ہر جگہ کا معائنہ کیا پھر اس نے انجن کا ڈھکن کھولا اور اس میں بھی بغور دیکھا۔

اس کے تصور میں وہ صورتحال گھوم گئی جب اس کا انجن گرم ہو جائے گا پھر اس کے کانوں میں رگڑ کی وہ پریشان کن آواز آئی تو اس کی نظروں میں ایک نرمی کی جھلک آ گئی اور وہ اس سے التجائی لہجے میں بولا:

"کیا تم اسے بیچنے میں میری مدد کرو گے اور تمھارے لیے تمہاری مرضی کا کمیشن ہو گا؟"

اس آدمی نے تھوڑی دیر سوچا اور بولا:

میں تمھارے ساتھ ضرور بھلائی کروں گا۔ میں اسے تم سے خرید لوں گا اور گاڑیوں کے عجائب گھر کے حوالے کر دوں گا"۔

زرقو نے خوشی سے کہا:

"تم فرشتہ ہو۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں کیسے تمھارے احسان کا بدلہ دوں"۔

اس شخص نے انگلیوں سے اپنا سر کھجلایا اور خوشی سے بولا:

""دعا سے، صرف میرے لیے خیر کی دعا کرنا۔

زرقو نے ایک ایسے لہجے میں کہا جو خوشی میں اس شخص سے کم نہیں تھا:

"!میں تمھارے لیے کیا کہوں؟ اللہ تمھیں (خچر بنائے جانے) کے شر سے محفوظ رکھے"

زرقو شہر میں بھری ہوئی جیب کے ساتھ پہنچا۔ وہ پورا دن سڑکوں پر آوارہ پھرتا رہا اور جو اس کا دل چاہا خریدتا رہا۔ اس نے اپنی رات ایک مہنگے ہوٹل میں گزاری۔ جیسے ہی فجر کی کرنیں ظاہر ہوئیں تو وہ بسوں کے ایک اڈہ کی سمت چل پڑا۔ وہ پہلی خالی سیٹ ملتے ہی اس پر جا بیٹھا اور اپنا چہرہ ٹکٹ بیچنے والے کی جانب مرکوز کرتے ہوئے گویا ہوا:

"پرندے کا دماغ"!

جو شخص اس کے پیچھے آیا وہ بھی بولا:

"پرندے کا دماغ؟"!

ان دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا تو وہ لرزق اور زرقو تھے جو ایک مرتبہ پھر اکٹھے ہو چکے تھے مگر ایک مختلف صورتحال میں سفر کر رہے تھے۔

ان دونوں پر صفائی ستھرائی اور خوشحالی کے اثرات نمایاں تھے۔ جس ہیئت میں وہ چلے تھے وہ بدل چکی تھی مگر باہمی رفاقت کا انداز تبدیل نہیں ہوا تھا۔ حد لرزق پر غالب آ گیا اور وہ غضبناک ہو کر زرقو سے بولا:

"تم سامنے والی سیٹ پر کیوں نہیں بیٹھے؟ دھوکہ دینا چاہتے ہو، ہاہاہا! اس طرح تم مجھ سے پہلے اترجاؤ گے اور تمہاری کامیابی کا اعلان کر دیا جائے گا! کیا ایسا نہیں ہے؟"

اچانک زرقو کے چہرے کا رنگ تبدیل ہو گیا۔ وہ متنبہ ہو گیا کہ وہ اپنی سواری کے بغیر واپس آ گیا ہے اور اسے لگا کہ لرزق اس کا مذاق اڑا رہا ہے۔ اس نے اپنا سر تھوڑا سا جھکایا پھر قدرے اداس لہجے میں لرزق سے پوچھا:

"تم نے (براقہ) کو کہاں چھوڑ دیا؟"

(براقہ! تم نے بھی یقین کر لیا! وہ سوائے ایک بوڑھی خچر کے کچھ نہ تھی جس کے عضلات ڈھیلے اور کھربو سیدہ ہو چکے تھی لہذا وقت آ چکا تھا کہ وہ میری رفاقت کے بوجھ سے چھٹکارا پالے)"۔"

لرزق نے حسرت آمیز مزاح سے کہا پھر ہتھیلی سے اپنی پیشانی کو صاف کیا، اپنا لعاب نگلا اور احتیاط سے پوچھا:

"مجھے (ادولفا) نظر نہیں آ رہا"!

زرقو نے جواباً ایک گونج دار قہقہہ لگایا اور بولا:

"یار کون سا (ادولفا)!؟ میں تمہیں زیادہ ہوشیار سمجھتا تھا۔ وہ ایک زنگ آلود آہنی کھلونے کے سوا کچھ نہیں تھی جس کو ایک پیچ ہٹانے سے ٹکڑے ٹکڑے کیا جا سکتا تھا۔ ذرا تصور کرو! مجھے خود نہیں پتا کہ میں کیسے اس پر سواری کی جرات کرتا تھا! پرانی طرز کا گیئر باکس، مرضی کا مالک انجن جو اگر ٹھنڈا ہو جائے تو اسے سٹارٹ کرنا مشکل اور اگر گرم ہو جائے تو اسے روکنا دشوار اور تار سے بندھی وہ بریک... چلتا پھرتا خطرہ۔ اکثر وہ قابو سے نکل جاتی اور گھومنے، چکر کاٹنے لگتی تو یا تو پٹرول ختم ہوتا یا وہ کسی رکاوٹ سے جا ٹکراتی... ہاہاہا!

ان دونوں نے برسوں کے راز افشا کر دیے اور ایک دوسرے کی سادہ لوحی کے قصے آپس میں سنائے کہ کیسے وہ دونوں اس کے پردے میں فائدہ اٹھاتے تھے۔

ان دونوں کو واپسی کی مسافت جانے کے فاصلے کی نسبت کہیں کم لگی۔ وہ گلی محلے کے چٹکلوں میں مشغول رہے اور ان کے مابین پرسکون ماحول بنا رہا حتیٰ کہ ان دونوں کی منزلِ مقصود کا سٹیشن نظر آنے لگا تو پریشانی نے ان کو آن گھیرا۔

لرزق نے اپنی ساتھی کو سرگوشی کی:

"سواریوں کے بنا ہم ان لوگوں کے سامنے کچھ حیثیت نہیں رکھتے۔ ہم ان دونوں سواریوں کا اپنے ساتھ واپس نہ آنے کا جواز کیسے پیش کریں گے؟"

زرقو نے اپنا سر ہلایا اور لاپروائی سے بولا:

"!کیا تم ان احمقوں کے بارے میں سوچ رہے ہو جنہوں نے یقین کر لیا تھا کہ دونوں سواریاں کائنات کے عجائب میں سے تھیں اور یہ کہ تمھارا وہ قحط زدہ خچر کوئی غیر معمولی سواری تھی"

لرزق باچھیں کھول کر ہنسا اور مزید بولا:

"!انھوں نے یقین کر لیا کہ جب تم ولی ونیکوکار (زراق) کی دُم کو چھوتے تھے تو تمھاری آنکھوں کا رنگ غائب ہو جاتا تھا اور وہ دونوں گہری سیاہ ہو جاتی تھیں۔ ہاہاہا"

زرقو نے اپنا ہاتھ لرزق کے ہاتھ پر مارا اور بولا:

"جیسا کہ انھوں نے یہ بھی یقین کر لیا تھا کہ اس ولی نے تمھارے والد کی خواب میں زیارت کی تھی اور مبارک خچر کے مالک لرزق نامی گھڑ سوار کی پیدائش کی خبر دی تھی... ہاہاہا

وہ دونوں معانقہ کرتے، قدم سے قدم اور نظر سے نظر ملاتے بس سے اترے۔"!

نفع کے احساس کا نشہ ان دونوں پر چھایا ہوا تھا اور وہ دونوں خوش و خرم قہوہ خانہ میں داخل ہوئے تو ان کی سواریوں کی دوڑ والی شرط کا ایک گواہ تیزی سے ان دونوں کی جانب پکا اور کہنے لگا:

"کل تم دونوں کے واپس نہ لوٹنے نے ہمیں پریشان کر دیا تھا"۔

زرقو نے جلدی سے جواز گھڑ لیا اور بولا:

"وہاں ہمیں کچھ معاملات پیش آ گئے تو ہم مجبور ہو گئے تھے کہ (ادولفا) اور (براقہ) کو ایک رشتہ دار کے ہاں چھوڑ دیں"۔

لیکن ایک پریشان کن شور اور تیز رگڑنے ان کی قطع کلامی کر دی۔ ایک بلند آواز اٹھی جو گاؤں والوں کو جمع ہونے کی دعوت دے رہی تھی۔

وہ دونوں تیزی سے باہر نکلے تو گاؤں کے ایک آدمی کو (براقہ) اور (ادولفا) کے وسط میں کھڑا پایا جو کسی فاتحانہ خوشی سے کہہ رہا تھا:

۔"آخر کار ہم نے خچر کو گاڑی کے ساتھ مناسب قیمت پر منسلک کر دیا اور سمجھ دار لوگ اب شرط لگانے کے شر سے محفوظ رہیں گے"!

زرقو مشتعل ہو کر چیخا:

"تم نے اسے میرے رشتہ دار سے چرایا ہے"!

اور لرزق نے بھڑک کر کہا:

"تم پر ضرور مبارک زراق کی لعنت ہو گی"!

وہ آدمی ہنسا اور بولا:

"اے بے وقوفو! میں ہی تم دونوں کا وہ رشتہ دار ہوں! اتنا کچھ ہونے کے بعد بھی کیا تمھیں سمجھ نہیں آئی؟"!

لرزق نے خوشی سے اپنی جیب کو ٹٹولا اور رزقو کو سرگوشی کی:

"میں گواہی دیتا ہوں کہ وہ نسل در نسل سچا ہے! واقعی (خچر بنایا جانا) بیماری پھیل گئی ہے"!

زرقو نے اپنی طرف سے اسے آہستہ سے کہا:

"ہاہا۔ لگتا ہے کہ یہ خچر اور ٹین کا ٹکڑا واقعی مبارک ہیں! اس احمق نے ہمارے مبینہ جھگڑے پر یقین کر لیا۔ ہم جس کی امید کر رہے تھے اس نے ان دونوں کے لیے اس سے پانچ گنا زائد رقم ادا کر دی اور وہ بھی بہت تگ و دو کے بعد۔ ہاہاہا"!

لرزق نے اپنی شہادت کی انگلی کی نوک اپنی کھوپڑی پر رگڑی اور قدرے مشکوک انداز میں زرقو سے بولا:

کیا ہم نے ان دونوں سواریوں کو بیچ کر غلطی تو نہیں کر دی؟ ہم ان دونوں سے مزید فائدہ اٹھا سکتے تھے"۔"

ان دونوں نے آپس میں معنی خیز نظروں کا تبادلہ کیا پھر زرقو کی آواز یہ کہتے ہوئے بلند ہوئی:

"وہ پرندہ جو جنگل میں پہلے درخت پر چہچہا رہا ہے، مبارک ہے۔ مجھے میرے دادا نے بتایا تھا کہ اس پرندہ کے اجداد میں سے ایک نے اعلیٰ حضرت زراق کو لوگوں کے ظلم اور ان کی اپنے لیے حقارت کی شکایت کی تھی کیونکہ کہ وہ اس کے چھوٹے دماغ کی وجہ سے اس کی توہین کرتے تھے۔ اعلیٰ حضرت کی طبیعت اس پرندے سے اتنی راضی ہوئی کہ انھوں نے گاؤں کو اس کے دماغ کے ساتھ منسوب کر دیا اور اس گاؤں کو 'پرندے کا دماغ' پکارا جانے لگا۔ مزید برآں اعلیٰ حضرت نے اس

درخت کی برکت کے لیے بھی دعا فرمائی جس کی شاخوں میں اس پرندہ نے گھونسلا بنا رکھا تھا"۔

گاؤں والوں کے طوطے اڑ گئے۔ انھوں نے متشکک نظروں کا تبادلہ کیا مگر لرزق اور زرقو کے گاؤں کا نام رکھے جانے والے قصے نے ان کی توجہ حاصل کر لی تھی۔ ان میں سے اکثریت نے اسے شناخت اور تاریخ کا مسئلہ بنا لیا۔ وہ جلدی سے اس درخت کی جانب چل پڑے جس کا ذکر زرقو نے کیا تھا اور اس کو خریدنے کے لیے باہم مقابلہ کرنے لگے جبکہ ان میں سب سے مقدم وہی شخص تھا جس نے سواریاں خریدی تھیں۔

ان لوگوں کے جھگڑے ایک نیلامی کی صورت اختیار کر گئے جس کا مقصد 'پرندہ کا دماغ' نامی درخت کو بیچنا تھا!

بولی دینے والوں کا جوش شدید ہوتا گیا اور پیشکشیں ایک ایسی بڑی رقم تک جا پہنچیں جس کو ادا کرنے کی سکت ان میں سے کسی کی بھی نہیں تھی مگر اس بات نے بھی ان کے درخت کو خریدنے کے اصرار کو کم نہ کیا۔

ان سب نے اس درخت کو ایک اجتماعی فائدے کا منصوبہ قرار دیے جانے پر اتفاق کر لیا اور اس کی قیمت بھی 'مصائب کے فنڈ' سے ادا کر دی جس میں وہ سب اپنے مالی چندے قحط اور خشک سالی کے موسموں کو مدنظر رکھتے ہوئے جمع کرواتے تھے۔

:نیلامی نے اتنی بڑی رقم کھینچ لی کہ لرزق اور زرقو کی نظریں پھیل گئیں اور وہ دونوں بیک وقت بول اٹھے

"برا ہو اس زبان کا جس نے درخت کہہ دیا اور جنگل نہیں کہا"!

فضیلہ ملہاق: آپ الجزائر سے تعلق رکھنے والی ممتاز اور مستوع ادیبہ اور مصنفہ ہیں۔ ناول، افسانہ اور شاعری تینوں ادبی اصناف میں ایک شاندار اور منفرد ادبی ہنر کی مالک ہیں۔ نیز علمی مطالعات اور قانون میں تحقیقی تصانیف بھی ان کا اختصاص رہا۔ فکری میدان میں آپ عربی، فرانسیسی اور انگریزی زبان میں لکھتی ہیں۔

ظاہری سچائی

جھوٹ نے ایک نیک بزرگ کا روپ دھارا اور سچائی کے
راستے میں یہ کہتا ہوا آن کھڑا ہوا:

''عزیز من کہاں جا رہی ہو؟''

سچائی اپنی معروف بے ساختگی سے بولی:

''وہاں، جہاں جھوٹ نہ ہو''

جھوٹ نے اپنا غصہ چھپایا اور خوشامدانہ انداز میں گویا ہوا:

''اس سے مشکل کوئی کام نہیں کہ تم جہاں ہو وہاں جھوٹ نہ ہو
کیونکہ تمہارا وجود ہی اس کو وہاں آنے کی دعوت دیتا ہے۔ اپنے
حال پر رحم کرو۔ تم تو انسان کی جہالت کی قیمت چکا رہی ہو''